هندوستان کا سب سے بڑا ریاضی دان اور ماہر تعلیم

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد

وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عظیم ریاضی دان جو مسئلہ ہفتوں کی کوشش سے حل نہ کر سکا
وہ ایک ''مولوی'' کے آستانے پر چند منٹوں میں حل ہو گیا

تحریر و تحقیق

ڈاکٹر ساجد امجد

بتعاون: جماعت ہفتم طلباء جامعہ نظامیہ رضویہ، اندرون لوہاری دروازہ، لاہور

رضا اکیڈمی (رجسٹرڈ) لاہور

میثم قادری

ہندوستان کا سب سے بڑا ریاضی دان اور ماہر تعلیم

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد

وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عظیم ریاضی دان جو مسئلہ ہفتوں کی کوشش سے حل نہ کر سکا
وہ ایک "مولوی" کے آستانے پر چند منٹوں میں حل ہو گیا

تحریر و تحقیق

ڈاکٹر ساجد امجد

بتعاون: جماعت ہفتم طلباء جامعہ نظامیہ رضویہ، اندرون لوہاری دروازہ، لاہور

رضا اکیڈمی ○ لاہور

سلسلہ کتب ۱۹۶

نام کتاب: .... ہندوستان کا سب سے بڑا ریاضی دان، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد

.... سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مصنف: .... ڈاکٹر ساجد امجد

تحریک: .... علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری

صفحات: ۹۶

بتعاون: .... جماعت ہفتم طلباء جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور

مطبع: .... احمد سجاد آرٹ پریس، لاہور فون: 7357159

ناشر: .... رضا اکیڈمی لاہور

ہدیہ: .... دعائے خیر بحق معاونین رضا اکیڈمی لاہور

نوٹ

بیرون جات کے حضرات بیس روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر

طلب فرمائیں

رضا اکیڈمی (رجسٹرڈ)

محبوب روڈ۔ رضا چوک۔ مسجد رضا۔ چاہ میراں فون: 7650440

لاہور نمبر ۳۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمۂ آغاز

فاضل علامہ ممتاز احمد سدیدی ازہری سلمہ اللہ تعالیٰ واعلیٰ درجاتہ عالم اسلام کی قدیم ترین اور محترم یونیورسٹی جامعہ ازہر شریف قاہرہ میں ''الشیخ احمد رضا خاں شاعراً عربیا'' کے عنوان پر مقالہ لکھ کر (۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) میں ایم فل کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں، الحمد للہ تعالیٰ۔ یہ مقالہ سات سو بیس صفحات پر مشتمل ہے اور چھپ گیا ہے، بطور تحدیث نعمت عرض ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں عربی میں اتنی ضخیم کتاب شائع کرنے کی سعادت پوری دنیا میں صرف ادارہ ''مؤسسۃ الشرف، لاہور'' کو حاصل ہوئی ہے۔ فالحمد للہ تعالیٰ علیٰ ذلک، اس اشاعت کا اہتمام حافظ نثار احمد قادری نے کیا

مقام صد شکر ہے کہ اب فاضل علامہ سدیدی جامعہ ازہر شریف ہی سے پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان ''علامہ فضل حق خیر آبادی............ دنیاہ وشعرہ العربی'' لکھ رہے ہیں اور یہ مقالہ تکمیل کے قریب ہے۔ قارئین کرام دعا فرمائیں کہ مولائے کریم انہیں جلد از جلد کامیابی حاصل کر کے واپس آکر دین و مسلک اور ملک و ملت کی خدمات جلیلہ کی توفیق عطا فرمائے۔

سب سے بڑا ریاضی دان............ ایک مولوی کے آستانے پر

کچھ عرصہ پہلے انہوں نے مجھے ماہنامہ سرگزشت کراچی کا شمارہ اپریل ۲۰۰۰ء دکھایا جس میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر اور ہندوستان کے مشہور ماہر ریاضی ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے حالات اور ان کی خدمات پر تفصیلی مقالہ شامل تھا۔ یہ مقالہ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحقیق اور محنت کا ثمر ہے۔

علامہ سدیدی نے بتایا کہ اس مقالہ کے پڑھنے سے مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ دنیائے ریاضی کا شہرہ آفاق فاضل اور ہندوؤں کے دعوائے حساب دانی کو حرف غلط ثابت

چیلنجوں کا قبول کرنا اس کی سرشت میں داخل تھا، اس پر مستزاد یہ کہ نصرت خداوندی اس کے شامل حال تھی اور وہ ہر قدم پر کامیابیوں کے جھنڈے گاڑتا ہوا سب مخالفین کو پیچھے چھوڑ گیا۔

اس مقالے کی تعارفی سطور میں ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ ان الفاظ سے کیا گیا ہے:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ لوگ اپنی ذات میں اس قدر غیر معمولی اور منفرد ہوتے ہیں کہ ان کی کوئی دوسری مثال پھر صدیوں تک نظر نہیں آتی، زیر نظر سرگزشت ایک ایسے ہی نابغہ روزگار کی ہے۔''

انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم اے درجہ اول میں پاس کیا، کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو کر پہلی پوزیشن حاصل کی، سر آئزک نیوٹن اسکالر شپ حاصل کی۔ جرمنی میں گوٹنجن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا، ریاضی کی مزید تعلیم اٹلی سے حاصل کی، واپسی پر مختلف عہدوں سے ہوتے ہوئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بنے۔

ایک دفعہ انہیں ریاضی کے ایک مسئلے میں الجھن پیش آگئی، کئی ہفتے کی پوری کوشش اور سوچ بچار کے بعد بھی وہ الجھن حل نہ ہو سکی تو ڈاکٹر صاحب نے جرمنی جانے کا پروگرام بنایا، تاکہ وہاں کے بڑے بڑے ماہرین ریاضی سے استفادہ کیا جائے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے چیئرمین علامہ سید سلیمان اشرف بہاری نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ بریلی کے بڑے مولوی صاحب سے ملاقات کر لیں ممکن ہے آپ کا مسئلہ حل ہو جائے، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں ریاضی کی تعلیم حاصل کر چکا ہوں، کئی ہفتے کی دماغ سوزی کے باوجود میں وہ مسئلہ حل نہیں کر سکا، آپ مجھے ایسے مولوی صاحب کے پاس جانے کا مشورہ دے رہے ہیں جنہوں نے کالج اور یونیورسٹی کی شکل بھی نہیں دیکھی وہ یہ مسئلہ کیسے حل کر سکیں گے؟

اس کے باوجود علامہ بہاری نے اصرار کیا اور کہا کہ ایک دفعہ آپ بریلی تشریف لے جائیں مسئلہ حل ہو گیا تو سبحان اللہ نہیں تو جرمنی کا راستہ کھلا ہے، آپ بعد میں بھی جا

سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین بادل ناخواستہ بریلی حاضر ہوئے، عصر اور مغرب کے درمیان ملاقات کا وقت مقرر تھا، بریلی کے بڑے مولوی صاحب نے پوچھا کیسے تشریف لائے؟ ڈاکٹر صاحب نے اپنا مسئلہ پیش کیا، انہوں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد فرمایا:

''لیجئے صاحب اللہ نے آپ کا مسئلہ حل کر دیا۔''

آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ڈاکٹر صاحب پر حیرتوں کے کتنے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں گے؟ وہ بے ساختہ پکار اٹھے:

''اس سے پہلے ہم علم لدنّی کے بارے میں سنا کرتے تھے، لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔''

یہ شخصیت صحیح معنوں میں نوبل پرائز کی مستحق ہے۔

شاہ محمد عارف اللہ میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے داڑھی رکھ لی تھی اور نماز بھی پڑھنے لگے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ داڑھی بریلی کے بڑے مولوی صاحب کی دین ہے۔ علامہ سدیدی صاحب کا کہنا یہ تھا کہ یہ واقعہ اگرچہ پہلے بھی پڑھا ہوا تھا لیکن یہ مقالہ پڑھنے کے بعد حیرت کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور احساس ہوتا ہے کہ اس مولوی کا علمی قد کتنا بلند تھا کہ وقت کا عظیم ریاضی دان اس کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔

وہ مولوی علم وفضل کا کوہ ہمالہ تھا، حدیث و تفسیر، فقہ و کلام، تصوف، شعر و شاعری، علم جفر اور نجوم جس علم کا ماہر بھی ان کے آستانے پر حاضر ہوا اس نے اعتراف کیا کہ ان کا مقام کہیں بلند و بالا ہے۔

لاری اڈہ بادامی باغ، لاہور کے پاس ایک نجومی محمد صدیق ہوتے تھے (اس وقت معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟) ایک دفعہ جامعہ نظامیہ رضویہ، راقم کے پاس آئے اور بریلی کے بڑے مولوی صاحب کے علم جفر کے چند رسائل طلب کئے، میں نے ان سے تعارف چاہا تو کہنے لگے میرے استاذ علم نجوم کے بہت بڑے ماہر تھے، ایبک روڈ پر بیٹھتے

تھے، ایک دفعہ شمالی ہند کے دورے پر گئے تو سوچا بریلی کے بڑے مولوی صاحب سے بھی ملاقات کرلیں۔ عصر کے بعد حاضر ہوئے۔ بڑے مولوی صاحب نے حاضرین میں سے ایک ایک شخص سے پوچھا کہ آپ کیسے تشریف لائے؟ جب میرے استاد سے پوچھا تو انہوں نے کہا میں کون ہوں؟ بڑے مولوی صاحب نے انہیں گھور کر دیکھا اور فرمایا اچھا اور ایک کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا اور کہا اس پر لکھو کہ میں کون ہوں؟ پھر کہا اب ان حروف کو الگ الگ لکھو جیسے کہ علم جفر کا قاعدہ ہے، پھر انہیں ہی کہا ان میں اس طرح ترتیب بدلو، یہ کرو، وہ کرو، چند دفعہ کے الٹ پھیر کے بعد کہا کہ ان حروف کو اکٹھا کر کے کلمات بناؤ، جب انہیں مرتب کیا تو یہ جملہ سامنے آیا:

تم نجومی ہو۔

میرے استاذ پر اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ فوراً ایک دونی جیب سے نکال کر نذر کی اور اسی وقت اٹھ کر چلے آئے۔ بدحواسی میں وہ پرچی بھی وہیں چھوڑ آئے، جس پر سوال کا جواب حل کیا تھا۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ بڑے مولوی صاحب کون تھے؟ تعجب ہے کہ آپ نہیں جانتے، ان کو تو ایک دنیا امام احمد رضا بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام سے جانتی ہے۔

سدیدی صاحب کے مشورے پر رضا اکیڈمی' لاہور کی مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ یہ مقالہ شائع کر کے تقسیم کرنا چاہیے۔ جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور کے ساتویں کلاس کے طلبہ نے بھی اس میں مالی تعاون کیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اراکین رضا اکیڈمی، لاہور مقالہ نگار ڈاکٹر ساجد امجد اور ادارہ ماہنامہ سرگزشت کراچی کے شکریہ کے ساتھ یہ مقالہ شائع کر کے مفت تقسیم کر رہے ہیں۔

مولوی کی ضرورت؟..........

مولوی چونکہ اسلام کا ترجمان ہے اس لئے لادینی اور طاغوتی قوتوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا ہے اور آج بھی کھٹک رہا ہے، انگریز نے اپنے دور حکومت میں

مولوی کی اہمیت کو کم کرنے بلکہ ختم کرنے کی شعوری کوششیں کیں مثلاً اس دور میں درس نظامی کے فاضل کی تنخواہ سترہ روپے اور فاضل عربی حکومت کا امتحان پاس کرنے والے کی تنخواہ پچیس روپے تھی۔ پھر زمینوں کے کاغذات پر جہاں کمیوں کا خانہ ہوتا، لوہار، کمہار، بڑھئی اس کے ساتھ ہی مولوی کا خانہ ہوتا۔

آج ہمارے معاشرے میں دینی اور اسلامی سوچ رکھنے والے احباب بھی جب ''مولوی'' کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کی تیوری چڑھ جاتی ہے اور لہجہ بدل جاتا ہے، آیئے آپ کو موجودہ دور کے ایک دانشور اور جدید تعلیم یافتہ شخصیت کی کچھ باتیں سنائیں۔ یہ ہیں قدرت اللہ شہاب ایسے درویش منش بیوروکریٹ اور واصف علی واصف ایسے صالح فکر دانشور کے حلقہ احباب کے آدمی جناب اشفاق احمد (تلقین شاہ) جو عرصہ دراز سے ریڈیو اور پھر ٹیلیویژن پر اپنے ڈراموں اور افسانوں کے ذریعے اظہار خیال کرتے رہتے ہیں۔

۱۸ نومبر ۲۰۰۱ء کو ان کا انٹرویو روزنامہ جنگ لندن کے سنڈے میگزین میں شائع ہوا تھا' اسی انٹرویو کے کچھ حصے سطور ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

اشفاق احمد: مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ ملا کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ اس کو جوتے مار کر باہر نکالو' کیا ہم دین کا مسئلہ خود نہیں جانتے؟ اکثر ایسی باتیں کرتے ہیں کہ اسلام میں ملائیت کی گنجایش ہی نہیں ہے۔ اس پر میں یہ کہتا ہوں کہ قانون میں وکیل کی گنجایش ہی نہیں، میں پڑھا لکھا آدمی ہوں' میں قانون پڑھ سکتا ہوں تو وکیل کی کیا ضرورت ہے، میں اپنا کیس خود لڑوں گا۔

کل آپ کو کوئی تکلیف ہو پیٹ میں اور آپ یہاں آجائیں تو میں کہوں یہ تو اپنڈکس ہے جلدی سے لیٹ جاؤ' میں چھری لاتا ہوں' میں نے کتاب پڑھی ہے اور وہ پاس رکھ کر تمہارا اپریشن کر دوں گا۔ لیکن آپ کہیں گے کہ مجھے مرنا منظور ہے لیکن میں تم سے اپریشن نہیں کراؤں گا۔

جنگ: تو کیا آپ کا خیال ہے کہ ملا کا ہونا ضروری ہے؟

اشفاق احمد: میرا یہ خیال نہیں۔ میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ آپ بتائیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس پر غور کیا جانا چاہیے۔ میں درس نظامی والوں کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ یہ آپ کا اتنا پرانا سلیبس ہے اس میں کوئی تبدیلی کریں جس پر انہوں نے کہا کہ ہم اس میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے لیکن آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ اپنے بچوں کو فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی ضرور پڑھائیں تاکہ جب کبھی ہمیں کوئی کام ہو، کوئی بیماری ہو تو ہم آپ کے پاس آئیں اور جب کبھی آپ نے کوئی دینی مسئلہ پوچھنا ہو تو آپ ہمارے پاس آئیں۔ دیکھئے عزیز من! جان ہمیں بہت پیاری ہے ہم ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتے ہیں، عزت ہمیں بہت پیاری ہے ہم وکیل کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن ایمان ہمیں پیارا نہیں اس لئے ہم کہتے ہیں کہ ہم ملاّ کو کیوں رکھیں؟ اس لئے درس نظامی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے بڑی اچھی بات کی کہ درس نظامی کے کورس کو ماڈرن کرنے کے لئے آپ ہمیں جو کہہ رہے ہیں یہ بالکل اسی طرح ہے کہ کل کو آپ کہیں گے ایل ایل بی کے کورس میں ٹیڈی بکریاں پالنے کے طریقے پڑھائے جائیں اور ایم بی بی ایس کے کورس میں جوئیں مارنے کے طریقے پڑھائے جائیں، ہنستے ہوئے اللہ کے واسطے کچھ سوچیں۔

جنگ: اشفاق صاحب جب آپ نے ملا کی حمایت شروع کی تو اس وقت کے ملاّ میں اور آج کے ملاّ میں بہت فرق ہے اس وقت کا ملاّ ایک مظلوم اور غریب آدمی تھا آج کا ملاّ بہت طاقتور ہے اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہے تو کیا اب بھی آپ اس کی حمایت کرتے ہیں؟

اشفاق احمد: میں اس کی پہلے سے زیادہ حمایت کرتا ہوں کیونکہ میں اس سے روز ملتا ہوں میں نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں جاتا ہوں میں نے ملاّ کو وہی پایا ہے جو آج سے ۲۰ برس پہلے تھا۔ یہ جو کلاشنکوف والے ہیں یہ ملاّ نہیں ہیں۔ اللہ کے واسطے یہ ملاّ نہیں ہیں۔ یہ سیاستدان ہیں جنہوں نے مولوی کا چولا پہنا ہوا ہے۔ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں یا مافیا ہیں یہ ملاّ نہیں ہے۔ ملاّ سے میں آپ کو ملاتا ہوں جو جمعدار سے کم تنخواہ لے رہا ہے۔ ۶۳۰ روپے تنخواہ لیتا ہے اور جمعہ کو خطبہ دیتا ہے۔ پلیز اصلی ملاّ کی پشت پناہی کریں اور ان بدبختوں

سے جان چھڑائیں۔

جنگ: تو پھر جہاد کرنے والے کون ہیں؟

اشفاق احمد: کون............؟

جنگ: کلاشنکوف کے ساتھ جہاد بھی تو کیا جا رہا ہے، کیا آپ اس جہاد کو جائز سمجھتے ہیں۔

اشفاق احمد: ہاں ہاں اگر آپ کے محلے کا ملاّ اس کی منظوری دیتا ہے تو یہ جہاد جائز ہے لیکن اگر کوئی کہتا ہے کہ تم جا کر شیعہ کو مار دو تو اس بات کی منظوری مولوی نہیں دے گا۔

جنگ: اشفاق صاحب آپ کیا بات فرما رہے ہیں؟ کچھ مولوی تو ظاہر ہے منظوری دیتے ہیں تبھی تو فرقہ وارانہ دہشت گردی چلتی ہے۔

اشفاق احمد: یہ ایک مافیا ہے۔ آپ کل مولوی کے روپ میں کوئی سکیم چلا دیں۔ داڑھی رکھ لیں اور چھوٹے چھوٹے ڈبوں والا عمامہ باندھ لیں۔ مافیا بن جائیں۔ ان لوگوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں یہ بندے سارے جن کے بڑے بڑے نام ہیں مولوی نہیں ہیں۔ ان کا کلاشنکوف سے، ان کا پیسے سے، ان کا باہر کی دولت سے تعلق ہے۔ ان کے خلاف ڈٹ کر جہاد کریں۔ جب آپ ملاّ کہہ دیتے ہیں تو ساری کی ساری برادری شمار ہوتی ہے اور پرویز مشرف بھی کہہ دیتے ہیں کہ ملاّ نے برباد کر دیا۔ ان کو کچھ نام دیں لیکن خدا کے واسطے یہ ملاّ نہیں ہیں یہ مولوی نہیں ہیں یہ عطائی ملاّ ہیں جس طرح عطائی ڈاکٹر ہوتے ہیں یہ اس طرح کے عطائی ملاّ ہیں۔

جنگ: صوفی اور ملاّ تو بالکل دو متضاد رویے ہیں لیکن آپ صوفی کے بھی حمایتی ہیں اور ملاّ کے بھی.........؟

اشفاق احمد: بہت زیادہ میں صوفی کا بہت حمایتی ہوں وہ اس لئے کہ صوفی دین کا عملی رخ پیش کرتا ہے۔ ملاّ دین کا فکری رخ لے کر چلتا ہے، میں نے آپ سے کہا نا کہ ملاّ ظالم، سخت اور سیاسی بن کر چلتا ہے۔ اس کی بھی ضرورت ہے اور ایک محبت کے ساتھ ذکر کرنے والا ہوتا ہے اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے یہ دونوں پول ہیں ایک مثبت اور دوسرا منفی جس سے

بلب جلتا ہے۔ آپ کسی ایک کو مثبت اور کسی دوسرے کو منفی نہیں کہہ سکتے۔ میں اس وقت عام مثبت اور منفی کی بات نہیں کر رہا بلکہ بجلی کی رو میں استعمال ہونے والے مثبت منفی پولز کی بات کر رہا ہوں، جو کہ ایک دوسرے کے لئے ضروری ہوتے ہیں، یہ دونوں ہوں تو بلب جلے گا خالی صوفی یا ملاّ بلب نہیں جلا سکتے۔ اسلام کی عملی زندگی کا نمونہ صوفی پیش کرتا ہے، خود اس پر عمل کر کے اور مولوی کہتا ہے کہ اگر تم نے مجھ سے کوئی بات پوچھنی ہے تو میں تمہیں قرآن و سنت کی بات بتا دیتا ہوں تم سے اس پر عمل ہوا جاتا ہے یا نہیں ہوا جاتا۔

جنگ: لیکن سر اگر ملاّ اتنا ہی آئیڈیل ہوتا تو معاشرے کا پسندیدہ آدمی ہوتا۔

اشفاق احمد: اتنا ہی آئیڈیل ہو ملاّ تو اب تک زندہ نہ رہے۔ یہ تو چلتا رہے گا۔ یہ کاروان اسلام کا چلتا رہے گا اور ملاّ اس میں اسی طرح زندہ رہے گا، میں نے بڑی کوشش کی اس کو نکالنے کی، علامہ اقبال نے بھی یہ کوشش کی، میں تو چھوٹا آدمی ہوں، مولانا روم نے بھی کی لیکن یہ تو چلے گا، یہ چوکیدار ہے یہ آواز دیتا رہے گا، سیٹی بجاتا رہے گا کہ خبردار۔

جنگ: علامہ اقبال کی بات نہیں مانی کونسی بات اور کس نے نہیں مانی؟

اشفاق احمد: نہیں مانی۔ یہ ملاّ اسلام سے نکل ہی نہیں سکتا۔ علامہ اقبال بہت بھلے آدمی تھے، وہ بے چارے روز سوچتے تھے انسانیت کے نام پر انہوں نے بھی بڑی بات کی ہے، اسلام کے نام پر انہوں نے بات کی ہے، صوفی کے نام پر انہوں نے بات کی ہے، اس ملاّ کو نکالو لیکن یہ ملاّ بڑا ٹیڑھا ہے، ملاّ میں اتنی کجیاں ہیں کہ آپ ان کو گننے بیٹھ جائیں تو آپ کو شام پڑ جائے، لیکن اس کے باوجود میرے باپ کو اسلام تک لانے والا وہی ملاّ ہے۔

دیکھئے میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ایک ملاّ کو پھانسی کی سزا ہوگئی وہ بھاگا اور چلتا چلتا آسام کے جنگلوں میں پہنچ گیا، وہاں ایک جگہ پر چھپ گیا وہاں بڑے بڑے نرسل ہوتے ہیں جہاں پر ہاتھی چھپ سکتے ہیں۔ اس نے وہاں پر دیکھا کہ جولاہے بیٹھے کپڑا بن رہے تھے، ان جولاہوں سے اس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ تو انہوں نے بتایا کہ ہم مسلمان ہیں، اس نے کہا کلمہ سناؤ تو انہوں نے کہا کہ ہم کو تو نہیں آتا،

اس نے پوچھا کہ تمہارا رسول کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں نہیں پتہ، لیکن ہیں مسلمان کیونکہ ہمارے دادا پردادا مسلمان تھے۔ اس نے کہا کہ دیکھو پتھر اکٹھے کرو۔ پتھر اکٹھے کر کے اس نے ایک کوٹھری بنائی، اس کو دروازہ لگایا اور ان سے کہا کہ میں یہاں کھڑا ہو کر ایک آواز نکالا کروں گا تم اس وقت اپنا کام چھوڑ کر یہاں پہنچ جایا کرنا، چنانچہ وہ وہاں پر اذان دینے لگا اور وہ لوگ اس کی آواز سن کر وہاں پہنچ جاتے اور جس طرح وہ کرتا اسی طرح وہ بھی نماز پڑھتے جاتے، اسی طرح دو تین سال بعد انگریز کے ہاتھوں وہ پکڑا گیا اور اس کو ہتھکڑی لگ گئی، تو وہ سارے جولاہے رونے لگے کہ ہمارا لیڈر پکڑا گیا اور مسجد کو تالا ڈال دیا تو اس نے جاتے ہوئے ان سے کہا کہ مجھے تو یہ کالے پانی لے کر جا رہے ہیں لیکن تم کو وہ وقت یاد ہیں تم ان ہی اوقات میں اسی طرح اس مسجد کے باہر آ کر اسی طرح کرتے رہنا، کیونکہ ان بیچاروں کو ابھی پوری نماز نہیں آتی تھی، تو وہ ویسے ہی کرتے رہے۔ ۲۳۱ (بلکہ 89 سال، کیونکہ 1857ء سے لے کر 1946ء تک اتنے ہی بنتے ہیں۔ ۱۲ قادری) گزرنے کے بعد جب ریفرنڈم ہوا تو وہ علاقہ پاکستان میں شامل ہوا، یہ سلہٹ کا علاقہ تھا وہ مسلمانوں اور ملّا کی وجہ سے شامل ہوا انہوں نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں ہم تو مشرقی پاکستان میں شامل ہوں گے، تو یہ تو چلے گا مجبوری ہے۔ اگر اس کے ساتھ دوستی کر لو گے تو ریلیکس ہو جائے گا۔ اس کو تو ہم نے معاشرے کا ''شودر'' بنا کر رکھا ہوا ہے۔ کسی بھی پڑھے لکھے آدمی سے پوچھیں سوائے میرے، صرف میں ہی ان کو لے کر چلتا ہوں کہ اللہ کے واسطے ان سے ملو۔

یہ ہیں جناب اشفاق احمد کے خیالات' عرض یہ کرنا ہے کہ ہمیں مولوی کے بارے میں اپنی سوچ کا زاویہ درست کرنا چاہیے، کبھی ہم نے سوچا کہ ایم۔ اے کے مساوی سند رکھنے والا دینی مدرسہ کا مدرس ماہانہ چار ہزار روپے تنخواہ پا رہا ہے، کالج اور یونیورسٹی کا مدرس پندرہ سے اٹھارہ ہزار تنخواہ لے رہا ہے، اتنے بڑے فرق کے باوجود دینی مدرسہ کا مدرس پانچ گھنٹے پڑھاتا ہے اور کالج کا لیکچرار ڈیڑھ دو گھنٹے پڑھا کر فارغ ہو جاتا ہے اس کے باوجود

اگر دین کے خادموں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جائے اور انہیں کہا جائے کہ یہ بھی تمہاری ذمہ داری ہے اور یہ بھی تو اس کی شکایت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہی کی جا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں دین اور خادمان دین کے بارے میں صحیح سوچ اور فکر عطا فرمائے۔

محمد عبدالحکیم شرف قادری
شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ
لاہور...... پاکستان

۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
۶/۱ اگست ۲۰۰۲ء

زندگی کے اہم واقعات

۱۸۷۷ء	پیدائش بہ مقام میرٹھ، بھارت
۱۸۸۹ء	ایم-اے او کالج (اسکول) میں داخلہ
۱۸۹۴ء	مارہرہ میں ماریسن اسلامیہ اسکول کا قیام
۱۸۹۵ء	بی اے میں شاندار کامیابی
۱۸۹۵ء	ایم اے او کالج میں ملازمت کا آغاز
۱۸۹۷ء	کلکتہ یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم اے (درجہ اول)
۱۸۹۸ء	الہ آباد یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم اے (درجہ اول)
۱۹۰۱ء	الہ آباد یونیورسٹی سے ریاضی میں ڈی ایس سی
۱۹۰۲ء	اسٹیٹ اسکالرشپ، کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ
۱۹۰۳ء	کیمبرج یونیورسٹی میں اول پوزیشن
۱۹۰۴ء	سر آئزک نیوٹن اسکالرشپ کا حصول
۱۹۰۵ء	جرمنی کی گوٹنجن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی
۱۹۰۵ء	اٹلی سے ریاضی میں مزید تعلیم
۱۹۰۶ء	مصر میں چند ماہ قیام اور جامعہ ازہر سے استفادہ
۱۹۰۶ء	علی گڑھ واپسی
۱۹۱۳ء	ایم او کالج کے قائم مقام پرنسپل
۱۹۱۹ء	ایم اے او کالج کے پرنسپل
۱۹۲۰ء	پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی
۱۹۲۶ء	پرو وائس چانسلری کے عہدے پر دوبارہ تقرری
۱۹۲۸ء	پرو وائس چانسلری سے استعفیٰ

۱۹۲۸ء سفر یورپ

۱۹۳۰ء مرکزی اسمبلی کے ممبر

۱۹۳۵ء مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلری کے عہدے پر انتخاب

۱۹۴۱ء وائس چانسلر کی حیثیت سے دوبارہ انتخاب

۱۹۴۴ء وائس چانسلری کے عہدے پر سہ بارہ انتخاب

۱۹۴۶ء وائس چانسلری کے عہدے سے استعفیٰ

۲۳ر دسمبر ۱۹۴۷ء فالج کے حملے سے لندن ک نرسنگ روم میں انتقال

۴ر فروری ۱۹۴۸ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مسجد کے احاطے میں سرسید کے مزار کے قریب تدفین۔

مزار پر علامہ اقبال کا یہ شعر کندہ ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حساب داں

عظیم ریاضی داں اور ماہر تعلیم سر ضیاء الدین احمد کی سرگزشت

تحریر و تحقیق ڈاکٹر ساجد امجد

اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ لوگ اپنی ذات میں اس قدر غیر معمولی اور منفرد ہوتے ہیں کہ ان کی کوئی دوسری مثال پھر صدیوں تک نظر نہیں آتی زیر نظر سرگزشت ایک ایسے ہی نابغہء روزگار کی سرگزشت ہے، دنیا اس کی ذات پر جس قدر بھی نازاں ہو کم ہے، علم ریاضی کے حوالے سے اس کی شہرت عام ہے مگر اس کا اندازہ ان کے حالات زندگی کے مطالعے سے ہی لگایا جا سکتا ہے، برصغیر ھند و پاک کے مسلمانوں میں علم کے چراغ روشن کرنے میں وہ سرسید کے بعد سب سے ممتاز مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔

یہ مٹی کی گائے ہے۔ یہ لکڑی کا گھوڑا ہے۔ چھوٹی سی بیل گاڑی ہے۔ بڑے بڑے کانوں والا ہاتھی ہے۔ ننھا ضیاء الدین ان کھلونوں کے درمیان خود بھی ایک کھلونا لگ رہا ہے۔ چابی کا ایسا کھلونا جو حرکت بھی کر سکتا ہے۔ کبھی ہاتھی کے کان مروڑتا ہے کبھی گائے کی پونچھ پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتا ہے۔ اس وقت گھر کے دوسرے بچے اسکول میں ہیں اس لئے اسے خوب موقع مل رہا ہے۔

ایک بڑی بی دور پڑی چارپائی پر لیٹی اس کی محویت کو بڑے غور سے دیکھ رہی ہیں، یہ بڑی بی ضیاء الدین کی نانی ہیں۔ ان بزرگ خاتون نے اس کی تربیت اپنے ذمے لے رکھی ہے۔

چار سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؟ یہ عمر کھلونے توڑنے کی ہوتی ہے، جوڑنے کی نہیں لیکن وہ بڑی دیر سے ٹوٹے ہوئے ایک کھلونے کو جوڑنے میں مشغول ہے۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے، وہ ہمیشہ اسی سلیقے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ گھر کے بچے جن کھلونوں کو توڑ کر

انہیں جوڑتا رہتا ہے۔

اس کی نانی کئی دن سے اس کی اس عادت کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں، کسی نے غور نہ کیا ہو لیکن وہ اسے بہت اہمیت دے رہی تھیں، اتفاق یہ ہوا کہ اسی وقت حافظ معین الدین، ضیاء الدین کے والد گھر میں داخل ہوئے۔ بڑی بی کو اپنی خوشی کا اظہار کرنے کا موقع مل گیا۔

"ذرا اپنے بیٹے کو تو دیکھو۔"

"کیا ہوا 'اماں؟"

"ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو پھر سے جوڑنے میں پسینے پسینے ہوا جا رہا ہے۔"

"ارے اماں، سب بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"سب بچے ایسے نہیں ہوتے۔ یہ سلیقہ تو میرے ضیاء کو ہی آتا ہے۔ مجال ہے جو اس کی ایک بھی چیز ادھر سے ادھر ہو جائے۔ جو کھلونے ٹوٹ گئے ہیں' انہیں بھی جوڑنے کی دھن میں لگا ہوا ہے۔"

"بعض بچے ہوتے ہیں ایسے۔"

"تم کبھی نہیں سمجھو گے لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ یہ اپنی پوری زندگی نہایت صاف ستھری اور سلیقے سے گزارے گا۔ دماغ کا بھی تیز ہے۔ اسے اچھی تعلیم دلانا۔"

"اس کے لیے تو میں نے بہت کچھ سوچا ہوا ہے اماں۔ آج کل انگریزی تعلیم کا رواج ہے۔ میں اسے انگریزی تعلیم دلاؤں گا۔"

"جو بھی تعلیم دلاؤ لیکن مذہبی تعلیم کے بعد۔"

"آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اس کی مذہبی تعلیم کی طرف سے غافل ہو جاؤں گا۔"

☆☆☆

پاؤں کھلنے کی دیر تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ہی عرب، ایران اور ترکستان کے مسلمان، حملہ آوروں کے لشکروں کے ساتھ اور کبھی اپنے طور پر آنا شروع ہو گئے۔ انہی آنے والوں میں ایک عربی النسل قبیلہ بھی تھا جس کی نسبت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے کی جاتی تھی۔ اس قبیلے کے کچھ افراد ہندوستان کے شہر میرٹھ میں آباد ہو گئے تھے۔

جب تک قدیم تعلیم کی قدر تھی، اس قبیلے کے افراد ممتاز عہدوں پر مامور تھے لیکن جب مسلمانوں کا اقبال گہنایا اور انگریزی کی عمل داری ہوئی تو تنزل نے گھر دیکھ لیا۔ میرٹھ جیسی چھوٹی جگہ پر یوں بھی جدید ذرائع تعلیم کا فقدان تھا اور پھر شدید مذہبی خیالات نے بھی یہاں کے باسیوں کو دوسرے بہت سے قصبات کی طرح کچھ دنوں انگریزی سے دور رکھا۔

سرسید احمد خاں کی کوششوں سے یہ کیفیت زیادہ دنوں تک نہ رہ سکی۔ مکتبی طرز کا اسکول قائم ہو گیا۔ بعض پرانے لوگوں نے اپنے طور پر انگریزی سیکھ لی تاکہ سرکاری ملازمت کے حصول میں آسانی ہو سکے۔

حافظ معین الدین اسی زبیری قبیلے کے ایک فرد تھے جنہوں نے محکمۂ مال میں ملازمت کر کے تحصیل داری تک ترقی کی تھی۔

حافظ معین الدین جدید زمانے کی جدید ضرورتوں سے واقف بھی تھے اور قائل بھی۔ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے فرید الدین کو بھی انگریزی تعلیم دلائی تھی اور اب ضیاء الدین کے لیے بھی ان کے عزائم یہی تھے۔

☆☆☆

''اماں اس کی عمر اب چار پانچ سال سے کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے لیکن اس میں بچوں والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ نہ شرارتیں کرتا ہے نہ اس کی طبیعت میں ضد کو دخل ہے۔ اپنی چیزیں تو اس حفاظت اور ترتیب سے رکھتا ہے کہ کیا کوئی بڑا آدمی رکھے گا۔'' ضیاء الدین کے والد نے اپنی اماں سے کہا:

"اس کی فطرت ابتدا ہی سے ہے۔ حافظہ اس غضب کا ہے کہ کوئی چیز کہیں رکھ کر بھولتا ہی نہیں ہے۔"

"میں سوچ رہا ہوں اسے حافظ روح اللہ خاں کے مدرسے میں بٹھا دوں۔ ذہن کا تیز ہے۔ مکتب سے جلد ہی فارغ ہو جائے گا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل کرا دوں گا۔"

"تم باپ ہو، جو بہتر سمجھو وہ کرو، میں گھر میں بیٹھنے والی کیا جانوں۔"

"اماں ہمارا زمانہ تو گزر گیا، آئندہ جو وقت آ رہا ہے اس میں انگریزی کی بڑی قدر ہوگی، بغیر انگریزی کے کام چلے گا نہیں۔ سرسید مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں جو کہتے ہیں انگریزی پڑھو، انہوں نے تو انگریزی اسکول تک کھول کر دے دیئے ہیں اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم ان سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

خوب اچھی طرح سوچنے اور مشورہ کرنے کے بعد حافظ معین الدین نے ضیاء الدین کا ہاتھ پکڑا اور قومی مدرسہ، میرٹھ میں لے گئے جہاں ان کے قبیلے کے دوسرے بہت سے بچے بھی پڑھتے تھے۔ یہ مکتبی طرز کا مدرسہ تھا لیکن چند ایسے اساتذہ اس مدرسے کو میسر آ گئے تھے کہ جو بچہ یہاں پڑھ لیتا تھا' اس کی بنیادیں استوار ہو جاتی تھیں اور مذہبی تعلیم کا ایسا نقش دل کی تختی پر تحریر ہو جاتا تھا کہ تمام زندگی قائم رہتا تھا۔

ضیاء الدین اس روز مدرسے سے گھر آیا تو ایسا خوش تھا جیسے دو جہاں کی دولت مل گئی ہو' نانی کے پہلو سے لگ کر دن بھر کی روداد سنانے بیٹھ گیا۔

"میرے بچے' تو نے تو کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہوگا' پہلے کچھ کھا پی لے پھر میں اطمینان سے بیٹھ کر تیری باتیں سنوں گی۔"

"نانی' بس آپ مدرسے کی باتیں سنتی جایئے' اتنی اچھی باتیں مدرسے میں ہوتی ہیں کہ میری تو بھوک ہی اڑ گئی۔"

''آپ نے جو سورتیں مجھے یاد کرائی تھیں، انہیں سن کر مولوی صاحب بہت خوش ہوئے' کہنے لگے' حافظ باپ کا بیٹا ہے سورتیں کیوں نہ یاد ہوں گی۔ میں نے بھی صاف کہہ دیا' جی نہیں یہ سورتیں مجھے میری نانی نے یاد کروائی ہیں۔''

''بیٹا یاد رکھو بڑوں کی بات کو جھٹلاتے نہیں ہیں' تمہیں چپ رہنا چاہیے تھا' میں نے یاد کرائیں یا تمہارے والد نے' بات تو ایک ہی ہے۔''

''اچھا نانی تو مجھ سے غلطی ہو گئی کل میں مولوی صاحب سے کہہ دوں گا' آپ ٹھیک کہہ رہے تھے۔''

اس کی نانی کو ہنسی آ گئی اب جو ہو گیا سو ہو گیا' اب اگر اپنی بات سے پھرے تو جھوٹے مشہور ہو جاؤ گے۔

وہ نہ جانے کتنی باتیں اور بتانے والا تھا لیکن نصیحت کے اس الٹ پھیر سے پریشان ہو گیا۔

نانی تو آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئیں اور وہ وہاں سے چپکے سے کھسک لیا۔

وہ اکیلا بیٹھا' نانی سے ہونے والی گفتگو پر غور کر رہا تھا' کبھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ہر حال میں سچ بولنا چاہیے' اس نے سچی بات بتا کر مولوی صاحب کی رائے کو غلط ثابت کیا' وہ ضرور شرمندہ ہوئے ہوں گے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بڑوں کی غلطی نہیں پکڑنی چاہیے اور یہ کہ جو بات کہہ دی' اس سے پھرنا نہیں چاہیے' اس کی نانی کی یہی نصیحت تھی۔

دوسرے دن وہ مدرسے گیا تو پہلے سے زیادہ مؤدب ہو چکا تھا' اس کے مولوی صاحب دوسرے بچوں کے سامنے اسے بطور مثال پیش کر رہے تھے۔

وہ تیزی سے تعلیم کی منزلیں طے کر رہا تھا' اپنی محنت اور تعلیم کے شوق سے وہ اپنے اساتذہ کے دلوں میں گھر کرتا جا رہا تھا' عجیب بچہ تھا کہ نہ کھیل سے سروکار نہ شرارتوں سے غرض' ہر وقت کتاب ہاتھ میں تھی اور وہ تھا۔

''ضیاء الدین' کسی وقت کھیل بھی لیا کرو' کھیلنے سے ہاتھ پاؤں کھلتے ہیں' صحت

اچھی رہتی ہے۔'' ایک دن اس کے والد نے کہا۔

''ابا جان' اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ میں کھیلوں ضیاء الدین نے معصومیت سے جواب دیا مدرسے کا کام جو کرنا ہوتا ہے۔''

''گھر کے لیے وہ اتنا کام دیتے ہیں کہ تم رات گئے تک کرتے رہتے ہو؟''

''ان کا کام تو زیادہ نہیں ہوتا لیکن وہ کام کرنے کے بعد میں اگلے دن کے کام کی مشق کرتا ہوں' مجھے معلوم ہوتا ہے' اب وہ کون سا کام دیں گے۔''

حافظ معین الدین اس کا جواب سن کر حیرت زدہ رہ گئے۔ بچوں کو ایک دن کا ہوم ورک کرنا دوبھر ہو جاتا ہے' یہ کیسا بچہ ہے کہ اگلے دن کا کام کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ انہوں نے اس کا ذکر اپنی بیوی سے بھی کیا اور بڑی تشویش کے ساتھ کہا۔

''مجھے تو ضیاء الدین کی طرف سے فکر لاحق ہو گئی ہے۔''

''اے ہے کیا ہوا میرے بچے کو؟''

''وہ ایک غیر معمولی ذہن کا بچہ ہے' ایسے بچے غیر معمولی توجہ چاہتے ہیں' ہمیں اس کا بہت زیادہ خیال رکھنا پڑے گا۔''

''توبہ آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''میں تو خود ڈر گیا ہوں' ایسے بچوں کو اگر سازگار حالات نہ ملیں تو انجام کچھ اچھا نہیں ہوتا۔''

''حالات کو سازگار بنانا ہماری ذمہ داری ہے۔''

'میں کل ہی بشیر الدین سے بات کرتا ہوں کہ ہمیں اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟'

مولوی بشیر الدین' ضیاء الدین کے چچا تھے اور اسے حساب اور اردو ان دنوں وہی پڑھا رہے تھے۔

حافظ معین الدین نے جب اپنے بھائی سے بات کی تو کچھ اور ہی طلسمی کہانیاں سامنے آئیں اور کچھ دیر کے لیے ضیاء الدین انہیں ماورائی ہستی نظر آنے لگا' ایسا بچہ جس کے

ہاتھ میں جادو کا ایسا چراغ ہے جسے رگڑتے ہی وہ ہر سبق یاد کر لیتا ہے' ہر گتھی کو پلک جھپکتے میں سلجھا دیتا ہے۔

''بھائی صاحب' آپ کے گھر میں ہندو بنیا پیدا ہو گیا ہے' اس کا حساب اتنا اچھا ہے کہ اب تو وہ مجھے حیرت زدہ کرنے لگا ہے' طویل رقمیں جن میں اس عمر کے بچے لکھ کر جوڑنے میں بھی غلطی کرتے ہیں' وہ انگلیوں پر جوڑ لیتا ہے' بعض اوقات تو انگلیوں پر جوڑنے کی زحمت بھی نہیں کرتا' میں بولتا جاتا ہوں اور وہ ذہن میں جوڑتا چلا جاتا ہے۔''

''حیرت ہے۔''

''حیرت تو مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے اسے ایک ایسا سوال حل کرنے کو دیا جو اس کی کتاب میں سرے سے ہے ہی نہیں' اس نے وہ سوال حل کر دیا' مزید حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے یہ دیکھا کہ اس نے اس سوال کے حل کا کوئی اور ہی طریقہ اختیار کیا تھا' جو طریقہ اس نے استعمال کیا' وہ کتابوں میں ملتا ہی نہیں ہے' مجھے تو لگتا ہے' بڑا ہو کر اس کا شمار ان لوگوں میں ہو گا جو سوال حل نہیں کرتے' فارمولے ایجاد کرتے ہیں۔''

''یہی بات میں نے محسوس کی ہے اور اسی لیے تمہارے پاس مشورے کے لیے آیا ہوں کہ اس کی تعلیم کے لیے اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''مکتب کی تعلیم تو اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔'' مولوی بشیر الدین نے کہا اس نے مدرسے میں رہ کر قرآن مجید ختم کر لیا ہے' فارسی اور انگریزی سے بھی واقفیت ہو گئی ہے لہٰذا اب آپ اسے ہائی اسکول میں داخل کرا دیں' وہاں اس کے جوہر خوب کھلیں گے۔''

''کیا کروں' میں تو اپنے حالات سے مجبور ہوں اور پھر اس کی عمر بھی کم ہے ورنہ میں اسے علی گڑھ بھیج دیتا' سرسید کی قائم کردہ درس گاہ ایسے ذہنوں کے لیے بہت مفید ہے۔''

''ہاں' بہتر تو یہی تھا لیکن فی الحال اسے میرٹھ ہی میں رہنے دیجیے' آپ کی نظروں کے سامنے رہے گا۔''

ضیاءالدین نے قومی مدرسے میں رہ کر کلام مجید ختم کیا' فارسی کی تعلیم مولوی عظیم اللہ سے' انگریزی کی تعلیم ماسٹر عبدالرحیم سے اور حساب اور اردو اپنے چچا سے حاصل کی۔

میرٹھ اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) کی پہلی چنگاری اسی شہر میں بھڑکی اور پھر شعلہ بن کر دوسرے شہروں تک پہنچی۔

بہت دنوں تک نفرت کی یہ چنگاریاں سینوں میں پلتی رہیں اور اپنی اقدار کی حفاظت کے لیے مذہبی تعلیم ہی کو تعلیم سمجھا جاتا رہا، لیکن جب سرسید احمد خان نے اپنے تعلیمی مشن کا آغاز کیا تو دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی انگریزی تعلیم کا چلن ہونے لگا' یہاں بھی کئی ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے سرسید کی آواز پر لبیک کہا' ان حضرات کی کوششوں سے یہاں بھی گورنمنٹ ہائی اسکول قائم ہو گیا جو انگریزی تعلیم کی بہترین درس گاہ تھی۔

حافظ معین الدین نے ضیاءالدین کا شوق علمی دیکھتے ہوئے اسے مکتب سے اٹھایا اور ہائی اسکول میں داخل کرادیا۔

ضیاءالدین اب گلے میں بستہ ڈال کر مکتب کی بجائے اسکول جانے لگا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے مختلف، بالکل الگ۔ اسکول کی طرف جانے والے بچے شرارتیں کرتے، راستے کے دکانداروں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے سفر طے کرتے تھے لیکن اس کی سنجیدگی ضرب المثل بن گئی تھی۔ وہ اپنی دھن میں مگن، دل ہی دل میں سبق دہراتا، اردگرد کی دنیا سے بے خبر چلتا رہتا۔

جب سے وہ ہائی اسکول میں داخل ہوا تھا، خود فراموشی کے عالم میں رہنے لگا تھا۔ پڑھنے کے سوا کوئی دوسری دلچسپی اس کی توجہ اپنی طرف مائل کر ہی نہیں سکتی تھی۔ گرمیوں کی راتوں میں جب وہ سونے کے لیے صحن میں لیٹتا تو انگلیوں اور ہتھیلیوں کے ذریعے سے حساب کے سوالات بناتا اور حل کرتا رہتا۔ اس شغل میں ایسا مشغول ہوتا کہ صبح ہو جاتی لیکن اسے نہ نیند کا خیال تھا نہ تھکن کا احساس۔

اس محویت کے باوجود لاابالی پن کا اس کے مزاج میں قطعی کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کی طبیعت میں نظم وضبط اور ترتیب اشیا کا فطری ملکہ تھا۔ گھر کی آمدنی سے لے کر اخراجات تک ہر چیز پر اس کی نظر تھی۔ ایک نہایت ذمے دار اور بڑی عمر کے آدمی کی طرح وہ گھریلو معاملات میں والد کو مشورے دینے لگا تھا۔ اس کے بڑے بھائی میں بھی وہ صلاحیت نہیں تھی جو اس میں تھی۔ اس کے اس احساس ذمے داری کو دیکھتے ہوئے اس کے والد نے صرف تیرہ برس کی عمر میں تمام خانہ داری کا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔

"گھر کے لیے راشن کی خریداری کا انتظام بھی تم کرو گے اور روزمرہ کے اخراجات کا حساب بھی تم ہی رکھو گے۔ یہ تمہاری حساب دانی کا امتحان ہے۔ دیکھتا ہوں تم اس میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہو۔"

یہ ایسی ذمے داری نہیں تھی کہ وہ آسانی سے اس میں پورا اتر سکتا لیکن اس کے حسن انتظام نے پورے گھر کو حیرت میں ڈال دیا۔ اپنی تعلیمی مصروفیت کے باوجود اسے یاد رہتا کہ گھر میں کس چیز کی ضرورت ہے۔ خود جنس منگواتا اور بڑے اہتمام سے اپنے کنجی تالے میں رکھتا۔

اس نے اس اہتمام اور انتظام کو بھی تعلیم کے سلسلے کی ایک کڑی بنا لیا۔ جنس کی الماری پر الجبرا کے تمام فارمولے لکھ دیے تھے۔ جب اس الماری کو کھولتا، ان فارمولوں کو دہرا لیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اضافی ذمے داری بھی اس کی تعلیم میں حارج نہ ہو سکی۔

اس زمانے میں اگرچہ ہائی اسکول اور کالج کی تعلیم عام ہو گئی تھی تاہم مڈل کلاس کی بڑی قدر و قیمت تھی اور مڈل پاس کو جلد سرکاری نوکریاں مل جایا کرتی تھیں۔

ضیاء الدین بھی تمام درجے طے کرتا ہوا مڈل تک پہنچ گیا۔ وقت اس تیزی سے گزرا تھا کہ اس کے والد کو یہ خبر سن کر حیرت سی ہوئی۔

"ایں! ابھی سے مڈل میں آ گئے۔ گویا سرکاری نوکری کے قابل ہو گئے؟"

اس زمانے میں مڈل کے امتحانات کا تعلق یونیورسٹی سے تھا اور خاصا سخت امتحان

سمجھا جاتا تھا اس لیے وہ بھی سخت محنت کر رہا تھا۔

اس کا مقابلہ اس کے ایک کلاس فیلو جگن ناتھ سے تھا۔ یہ لڑکا اردو مڈل کر کے انگریزی مڈل میں آیا تھا۔ ایسے طلبہ ریاضی میں بہت قابل ہوتے تھے۔ جگن ناتھ کو بھی اپنی حساب دانی پر بڑا ناز تھا۔ اس کا دعوی تو یہی تھا کہ ضیاء الدین مسلمان ہے اس لیے حساب میں میرا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ جگن ناتھ آتے جاتے اسے اس کے مسلمان ہونے کا طعنہ دیتا رہتا تھا۔ جیسے جیسے امتحان کے دن قریب آتے جا رہے تھے، جگن ناتھ کے دعووں میں چمک آتی جا رہی تھی۔

''ممکن ہی نہیں کہ تم حساب میں میرا مقابلہ کر سکو۔''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا۔''

''کیا مذہب تبدیل کر رہے ہو؟''

''میں کیوں مذہب تبدیل کرنے لگا؟''

''تو پھر کس طرح کامیابی کا دعوی کر سکتے ہو؟ مسلمان ہو کر مجھ سے مقابلہ اور وہ بھی حساب میں۔ ہے نا ہنسنے کی بات۔''

''میں مسلمان بھی رہوں گا اور اپنا دعوی بھی پورا کروں گا۔''

جگن ناتھ نے پھر ایک استہزائیہ قہقہہ بلند کیا اور ان ہندو لڑکوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جو اس کی حمایت میں شور مچاتے رہتے تھے۔

''ضیاء الدین، تمہیں اس جگن ناتھ کے بچے کو نیچا دکھانا ہی پڑے گا'' ان مسلمان لڑکوں نے کہا جو اس کے پاس آ کر جمع ہو گئے تھے۔

''بار بار مسلمان ہونے کے طعنے دیتا ہے جیسے مسلمانوں کو تو حساب آتا ہی نہیں'' ایک اور لڑکے نے کہا۔

''مسلمانوں کا حساب ابھی اس نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ اس کا سر تو اپنا ضیاء الدین نیچا کرے گا۔''

لڑکے اپنی اپنی باتیں کر رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ کسی مضمون میں اہلیت اور نا اہلی میں ہندو، مسلمان کا سوال کیوں آنے لگا ہے؟ اگر ہندوؤں کو اپنی حساب دانی پر ناز ہے تو ہماری تاریخ بھی ایسے زعما سے خالی نہیں ہے۔ البیرونی، عمر خیام کے کارنامے تاریخ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں پھر آج ایسی کیا بات ہوگئی کہ حساب کا مضمون، مسلمانوں کے لیے طعنہ بن گیا ہے۔ اس میں ضرور ہماری کوتاہی ہے۔ ہم نے اس طعنے کو سچ جان کر یہ میدان ہندوؤں کے لیے خالی چھوڑ دیا ہے۔ میں اس طعنے کو غلط ثابت کروں گا۔

اس نے گھر آتے ہی مسلمان سائنس دانوں کے کارنامے پڑھنے شروع کر دیے۔ ان کارناموں نے اسے ایک اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔ ''سنا ہے تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اگر نہیں بھی دہراتی تو میں اسے مجبور کر دوں گا۔ میں اپنی محنت سے وہی دور واپس لاؤں گا۔ میں پورے ہندوستان کو دکھاؤں گا کہ مسلمان اس الزام کے اہل نہیں ہیں۔ ایک جگن ناتھ کیا، میں تمام ہندوؤں کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤں گا۔''

وہ باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں شریک ہوا تو رات بھر کے خیالات اس کے ذہن میں تازہ تھے۔ یکسوئی کے ساتھ نماز بھی نہ پڑھ سکا۔ اسکول پہنچا تو اس کی خاموشی مزید گہری ہو چکی تھی۔ وہ تصور ہی تصور میں خوارزم اور نیشاپور کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ بغداد اور نیشاپور کے علماء اس سے باتیں کر رہے تھے۔ اقلیدس کی شکلیں اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔

''ضیاء الدین آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' اس کے ایک ہم جماعت نے اس سے پوچھا۔

''کیا ہو گیا ہے؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن آج تم بدلے بدلے لگ رہے ہو۔ جیسے رات بھر کوئی خواب دیکھتے رہے ہو اور ابھی تک اس کے اثر میں ہو۔''

''ہاں میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے۔ بہت ہی ڈراؤنا خواب۔ عروج اور

زوال کا خواب۔ کامیابی اور نامرادی کا خواب۔''

''یہ دیکھو، آج تم باتیں بھی عجیب سی کر رہے ہو، اس کے ہم جماعت نے اسے ٹوکا۔''

''وہ باتیں جو ہمارے حافظے سے اتر جاتی ہیں، ہمیں اسی طرح عجیب سی لگنے لگتی ہیں۔ ہم اپنے بزرگوں کے کارناموں کو اس قدر بھلا چکے ہیں کہ اب ان کا ذکر بھی کیا جائے تو عجیب سا لگتا ہے۔ ہمارے مسلمان سائنس دانوں نے اپنی حساب دانی سے زمین کا قطر، دریاؤں کی گہرائی، وقت کی رفتار تک ناپ لی تھی اور آج یہ حال کہ جگن ناتھ نام کا ایک لڑکا کھڑا ہوتا ہے اور برسرِ عام کہتا ہے، مسلمانوں کو حساب نہیں آتا۔''

''اوہ، تو یہ بات ہے۔ جگن ناتھ کا غصہ ابھی تک تم پر سوار ہے۔ کہو تو ٹھکائی کر دیں پھر تو غصہ اتر جائے گا۔''

''بس' اب مسلمانوں کا یہی کام رہ گیا ہے کہ کوئی صحیح بات کہے تو ہم اس کی ٹھکائی کر دیں۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ہمیں ایسی مثالیں قائم کرنی ہوں گی کہ اس کا یہ سچ' جھوٹ میں بدل جائے پھر کسی کو یہ کہنے کی جرات نہ ہو کہ مسلمان حساب نہیں جانتے۔''

''یہ مثال قائم کون کرے گا؟''

''میں قائم کروں گا۔ میں جگن ناتھ کو بتاؤں گا کہ میں مسلمان ہوتے ہوئے بھی حساب میں اس سے اچھا ہوں۔''

اس دن کے بعد سے وہ باتیں بھی حساب کی زبان میں کرنے لگا تھا۔ خود ہی سوال بناتا، خود ہی انہیں حل کرتا۔ دن اور رات کا فرق ہی اس نے مٹا دیا تھا۔

ایک کتاب اسے ایسی مل گئی جس میں اقلیدس کی دو سو مشقیں تھیں' اس نے ان مشقوں کو حل کر ڈالا۔ جو مشقیں سمجھ میں نہیں آئیں' اس نے انہیں زبانی یاد کر لیا۔ ایک مجنوں تھا جو اپنی لیلیٰ کی تلاش میں ایک کتاب سے دوسری کتاب کا سفر طے کر رہا تھا۔ امتحان کا

زمانہ آنے تک وہ علمیت کے اعتبار سے اپنی جماعت سے کئی جماعتیں آگے جا چکا تھا۔

اس دن حساب کا پرچہ تھا۔ اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ اسی لیے وہ اس رات آرام سے سویا تھا تاکہ امتحان گاہ میں تازہ دم پہنچے۔ وہ امتحان دینے پہنچا تو جگن ناتھ سے اس کا آمنا سامنا ہوا۔ جگن ناتھ کے ہونٹوں پر تمسخر آمیز ہنسی تھی، جبکہ وہ بے کراں سمندر کی طرح پرسکون تھا۔ اقلیدس کے حصے میں چار مشقیں امتحان میں آئیں جن کی نسبت ہدایت تھی کہ ان میں سے کوئی دو حل کی جائیں۔ وہ تو دوسو مشقیں حل کر چکا تھا۔ اس نے چاروں مشقوں کو حل کرنے کے بعد کاپی پر لکھ دیا کہ کوئی سی دو جانچ لی جائیں۔ یہ اس کے اعتماد کی حد تھی۔ اس کا یہ اعتماد ممتحن کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ وہ درجہ اول میں کامیاب ہوا جبکہ اس کا حریف دوسرے درجے میں کامیاب ہوا۔ ضیاء الدین کو قابلیت کا وظیفہ بھی ملا اور چونکہ ریاضی اور تاریخ میں بہترین نمبر تھے اس لیے امتیازی سرٹیفکیٹ بھی ملا۔

ضیاء الدین نے اس اندازے کو درست ثابت کر دیا تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے۔ اس نے جگن ناتھ کے اس عقیدے کو بھی باطل کر دیا تھا کہ مسلمان حساب نہیں جانتے۔ میرٹھ میں اس کی اس شاندار کامیابی کی گونج دور دور تک سنائی دی۔ ایک مسلمان لڑکے کی ریاضی میں ایسی شاندار کامیابی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس کا حریف لڑکا ہندو تھا اس لیے اس کامیابی نے دوسرا ہی رنگ اختیار کر لیا۔ اس کی کامیابی میرٹھ کے مسلمانوں کی کامیابی سمجھی جا رہی تھی۔

حافظ معین الدین کے دیوان خانے میں آج بڑی رونق تھی۔ رئیسانِ میرٹھ کے علاوہ مولوی مشتاق حسین بھی امروہہ سے آئے ہوئے تھے۔ یہ امروہہ کے زمیندار بھی تھے اور سرسید کے فیض یافتہ بھی جو ضیاء الدین کی کامیابی پر شاداں و فرحاں میرٹھ پہنچ گئے تھے۔ ان سب کی رائے یہ تھی کہ ضیاء الدین کو علی گڑھ کے ایم اے او کالج کے متعلقہ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ اس لیے بھی کہ اس سے اعلیٰ معیار کا اسکول ہندوستان بھر میں نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس سے متصل کالج

میں داخلہ خود بخود مل جائے گا۔ اس کے بڑے بھائی فرید الدین احمد پہلے ہی وہاں پڑھ رہے تھے اس لیے یہ سہولت فوراً نظر آ گئی کہ نگرانی کے لیے بڑا بھائی موجود ہے۔ ضیاء الدین دعاؤں اور وظیفوں کی چھاؤں میں علی گڑھ روانہ ہو گیا۔

سرسید کی قائم کردہ اس دانش گاہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ ہر کام سلیقے سے کرنے کا عادی تھا اس لیے یہاں کا نظم و ضبط اس کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ یہاں کے طلبہ' اساتذہ' عمارت' ڈسپلن سب کچھ اس کی توقع سے بڑھ کر تھا۔ یہاں کے تعلیمی ماحول نے اس کے شوق کو پر لگا دیے۔ گھر سے دور رہ کر اسے پڑھنے کے سوا کوئی دوسرا کام تھا ہی نہیں۔ جلد ہی اس کا شمار بہترین اور ذہین طلبہ میں ہونے لگا۔ اس کے ہم جماعتوں میں دو نمایاں طالب علم اور بھی تھے۔ ایک عبدالحق (جو بعد میں بابائے اردو کے لقب سے مشہور ہوئے) اور دوسرے یعقوب حسن (جو بعد میں وزیر مدراس گورنمنٹ ہوئے)۔

اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ہورسٹ تھے اور میر ولایت حسین سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ امتحان کا زمانہ قریب تھا اور ان دونوں حضرات کے درمیان یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ امتحان انٹرنیس میں کون طالب علم اول آئے گا؟ مسٹر ہورسٹ کا خیال تھا کہ یہ اعزاز یعقوب حسن کو ملے گا جبکہ میر ولایت حسین کا ووٹ عبدالحق کے حق میں تھا۔

اتفاق سے ضیاء الدین کا گزر ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی طرف ہوا اور یہ گفتگو اس کی سماعت تک پہنچ گئی۔ وہ بہت دیر تک اس انتظار میں کمرے کے دروازے سے کان لگائے کھڑا رہا کہ شاید اس کا نام بھی آئے، لیکن گفتگو نے کوئی اور رخ اختیار کر لیا۔ اس کے نام کا کسی کو خیال تک نہیں آیا۔ اس نے اسی دن سے اپنی کوشش میں اضافہ کر دیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ دونوں کی پیش گوئی کو غلط ثابت کر دے گا۔

وہ خاموش طبع تھا اس لیے اساتذہ کو اس کی قابلیت کا اندازہ نہ ہو سکا اور چپکے چپکے پوزیشن لانے کی تیاری کرتا رہا۔ امتحان ہوئے۔ امتحان کے بعد نتیجہ آیا تو ہیڈ ماسٹر اور سیکنڈ ہیڈ ماسٹر دونوں کی قیاس آرائیاں غلط ثابت ہو چکی تھیں۔ عبدالحق نمبر ۱۴ پر اور یعقوب حسن

درجہء دوم میں کامیاب ہوئے جبکہ ضیاء الدین نے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو کر چوتھی پوزیشن لی۔ اس کامیابی پر اسے میڈل اور محکمہء تعلیم سے سرکاری وظیفہ ملا۔

اس کامیابی نے اس کے شوق میں اضافہ بھی کیا اور ترقی کی راہیں بھی کھول دیں۔ اس کامیابی کے بعد اس نے سائنس لینے کا ارادہ کیا لیکن مصیبت یہ تھی کہ ایم اے او کالج میں اس مضمون کا انتظام ہی نہیں تھا۔ اسے مجبوراً ایم۔ سی کالج الہ آباد میں داخلہ لینا پڑا۔

مولوی سمیع اللہ خان نے جو ایم اے او کالج کے بانیوں میں سے تھے، بعض اختلافات کی وجہ سے اس کالج سے قطع تعلق کر لیا تھا اور الہ آباد میں مسلم بورڈنگ ہائس قائم کر دیا تھا تا کہ علی گڑھ سے جو طلبہ یہاں آئیں، ان کی رہائش کا انتظام ہو سکے۔ اس سہولت کی موجودگی کے بعد الہ آباد میں رہنا اس کے مشکل نہیں تھا۔

اس کالج میں ریاضی کے پروفیسر کے طور پر اسے مشہور زمانہ پروفیسر گنند رناتھ چکرورتی نصیب ہوئے۔ اس کے تو جیسے بھاگ کھل گئے۔ اس کی ذہانت کی نشونما کے لیے ایسے ہی پروفیسر کی ضرورت تھی۔ اسے کلاس میں بیٹھتے ہوئے ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ مسٹر چکرورتی نے ایک روز چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''مسٹر ضیاء الدین! تم کالج سے باہر کسی سے پڑھتے بھی ہو؟''

''جی نہیں۔ پڑھتا ضرور ہوں لیکن خود۔ کسی اور کی محنت کا دخل نہیں۔''

''اس میں غلط بیانی کتنی ہے؟''

''ایک فیصد بھی نہیں۔''

''پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو سوال میں نے ابھی تک کلاس میں حل ہی نہیں کرائے، تم نے انہیں بھی حل کر دیا اور بالکل صحیح۔''

''بات یہ ہے سر کہ میں نے کالج میں داخلے سے پہلے ہی ریاضی کا کورس اپنی ذاتی محنت سے ختم کر لیا تھا۔ اب تو میں اسے صرف دہرا رہا ہوں۔ شاید اس لیے مجھے سہولت ہو

جاتی ہے۔"

پروفیسر چکرورتی اب پہلے سے بھی زیادہ حیران ہو گئے۔ اگر اس کا بیان درست بھی تھا تو بھی یہ ایک دشوار بات تھی کہ کوئی طالب علم اگلی جماعت کا کورس اپنی ذاتی لیاقت کے بل پر ختم کر لے اور وہ بھی ریاضی کا کورس۔

"کلاس ختم ہونے کے بعد تم میرے کمرے میں آنا۔"

"یس سر!"

پیریڈ ختم ہوا۔ پروفیسر چکرورتی کلاس سے نکل کر اپنے کمرے میں گئے۔ وہ بھی کلاس سے نکلا اور ان کے پاس پہنچ گیا۔

"آپ نے مجھے بلایا تھا سر!"

"ہاں۔ بیٹھو۔"

انہوں نے ایک کاغذ پر کسی سوال کی عبارت نقل کی اور وہ کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ سوال مجھے کئی روز سے پریشان کر رہا ہے۔ شاید تم اسے حل کر سکو" انہوں نے کہا۔

"جب آپ کو کئی دن لگ گئے ہیں اور ہنوز حل طلب ہے تو پھر میں کس طرح حل کر سکتا ہوں؟"

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟ میں جب تک یہ کتاب پڑھتا ہوں، تم کوشش کر دیکھو۔"

انہوں نے ایک کتاب ہاتھ میں اٹھالی اور ضیاء الدین ان کے دیئے ہوئے سوال کو حل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ لکھتا رہا، کاٹتا رہا۔ ہر مرتبہ اسے ناکامی ہو رہی تھی۔ چکرورتی وقفے وقفے سے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے تھے اور پھر کتاب پڑھنے لگتے تھے۔ اس نے کئی طریقوں سے اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی لیکن کہیں نہ کہیں کوئی غلطی

ہ جاتی تھی پھر ایک مرتبہ وہ اپنی حالت پر خود مسکرایا۔

"یہ لیجئے سر۔ سوال میں نے حل کر دیا۔"

"برخوردار! آپ نے سوال حل کیسے کر لیا جبکہ میں نے جان بوجھ کر ایک رقم ہی غلط لکھ دی تھی" پروفیسر چکرورتی نے کہا۔

"اسی لیے تو اتنی دیر لگ گئی۔ بہر حال، وہ رقم میں نے درست کر دی ہے۔ یہ دیکھئے" اس نے انہیں کاپی دکھاتے ہوئے کہا "اگر اس رقم کی جگہ یہ رقم لکھ دی جائے تو سوال بالکل سیدھا ہے۔ غالباً یہی وہ رقم تھی جو آپ نے غلط لکھ دی تھی۔"

"شاباش! یہ سوال ایسا تھا کہ اگر کسی عام استاد کو بھی دیا جاتا تو وہ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے تم پر فخر ہے کہ تم میرے شاگرد ہو۔"

پروفیسر چکرورتی اس سے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے مولوی سمیع اللہ خان کے سامنے بھی ان کی تعریف کی۔

"جناب، میں اس لڑکے کی ذہانت اور ریاضی میں اس کی قابلیت دیکھ کر اتنا خوش ہوا جیسے کوئی بادلوں کے بغیر برسنے والی بارش کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائے۔"

ایک مسلمان لڑکا اور ریاضی میں اس کا ایسا شوق! مولوی صاحب نے بورڈنگ ہاؤس فنڈ سے اس کے لیے پانچ روپے ماہوار کا وظیفہ جاری کر دیا۔

الہ آباد سے ایف اے پاس کرنے کے وہ دوبارہ ایم اے او کالج آ گیا اور ایڈیشنل ریاضی کے ساتھ بی۔اے میں داخلہ لے لیا۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھا کہ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے اردگرد کے ماحول پر بھی نظر ڈال سکتا تھا، قوم کی زبوں حالی پر غور کر سکتا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ اس کے ہم قوم یعنی مسلمان، تعلیم سے بہت دور ہیں۔ ان لوگوں کا تو ذکر ہی کیا جو مقدور نہیں رکھتے، ایسے لوگ بھی ہیں جو وسائل رکھنے کے باوجود اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلا رہے ہیں۔

مردم شماری کرائی جائے اور اسباب معلوم کیئے جائیں۔ جب یہ اسباب معلوم ہو جائیں تو
گورنمنٹ سے ان اسباب کو دور کرنے کی سفارش کی جائے۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور اس کام
کے لیے طلبہ کے وفود تشکیل دیئے گئے۔

ضیاء الدین نے اپنے لیے علی گڑھ سے چالیس میل کے فاصلے پر مارہرہ کا علاقہ
پسند کیا کیونکہ وہاں اس کے کئی قریبی رشتے دار آباد تھے۔ وہ تو جو کام کرتا تھا' اس میں اعلیٰ
درجے کا سلیقہ اور تنظیم شامل ہوتے تھے۔ وہ مردم شماری کے لیے یہاں آیا تھا لیکن اپنی خوش
بیانی اور مدلل تقریروں سے قصبے کے بزرگوں کے دل جیت لئے۔

سروے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ یہاں کے مسلمان انگریزی تعلیم سے متنفر ہیں
اور اسے مذہب کے خلاف جانتے ہیں۔ اس نے گھر گھر جا کر اس غلط فہمی کو دور کیا اور آخر
میں ایک جلسے کا اہتمام بھی کیا۔ اس جلسے میں اس نے اپنے انگریزی کے پروفیسر سر تھیوڈور
ماریسن کو خاص طور مدعو کیا۔ تمام عمائد قصبہ شریک تھے۔ اس نے ایسی دلکش تقریر کی ....
مسلمانوں کی تعلیمی بدحالی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ اہل جلسہ کو رلا دیا۔

"اس علاقے میں فوری طور پر ایک انگریزی اسکول کی اشد ضرورت ہے۔"

اس نے اعلان کیا اور پورے جلسے نے تائید کی۔ اسی وقت ایک کمیٹی تشکیل
گئی۔ عہدے داروں کا انتخاب ہوا۔ مخیر حضرات نے مالی امداد کا اعلان کیا اور "ماریسن
اسلامیہ اسکول" کی بنیاد پڑ گئی۔

یہ ایک طالب علم کا ایسا کارنامہ تھا جسے سر سید احمد خان کی تعلیمات کا اثر بھی کہا
سکتا تھا اور ضیاء الدین کی روح کی پکار بھی۔ وہ مڈل کلاس سے بی۔ اے تک آ گیا تھا۔ میر
سے علی گڑھ تک کا سفر طے کر لیا تھا لیکن اپنے ابتدائی حریف جگن ناتھ کے طنز کو نہیں بھولا تھ
وہ مسلمانوں کی پیشانی سے اس داغ کو مٹا دینا چاہتا تھا کہ وہ ریاضی میں کمزور ہوتے ہیں
تعلیمی زوال کا شکار ہیں۔ یہ مدرسہ اس کی اسی کوشش کا پہلا مرحلہ تھا۔

تھا۔اس نے اپنے اساتذہ کو مایوس نہیں کیا۔ایک ساتھ کئی کامیابیاں اس کے حصے میں آئیں۔ایڈیشنل ریاضی میں آنرز کے ساتھ اول درجے میں کامیاب ہوا اور سائنس کورس میں اول آیا۔یونیورسٹی میں تیسرا نمبر اور سائنس کے طلبہ میں اول۔

اس نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔اب قوم کا فرض تھا کہ اس ستارے کو ماہتاب بنائے۔سب سے پہلے اس کی مادر علمی نے اسے آواز دی۔جن دیواروں کے سہارے چلتے ہوئے اس نے چلنا سیکھا تھا' اب وہی دیواریں اس کا سہارا ڈھونڈ رہی تھیں۔اسسٹنٹ پروفیسر ریاضی کے عہدے پر عارضی تقرری کی پیش کش ہوئی۔یہی تو اس کی معراج تھی۔وہ مسلمان طلبہ کے دلوں میں علم کی شمع روشن کرنے کی مہم پر نکلا ہوا تھا۔اس نے ساٹھ روپے ماہوار کی یہ عارضی نوکری قبول کر لی۔یہ سوچے بغیر کہ بازار میں اس کی قیمت کیا ہے؟ دیسی ریاستوں کے دربار اس کے لیے آغوش کشا تھے۔ترقی کا ہر دروازہ چشم براہ تھا لیکن وہ ایم اے او کالج کی دہلیز پر پیشانی رکھ چکا تھا۔

ایک مرتبہ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ڈپٹی کلکٹری اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ یہ عہدہ معراج ترقی متصور ہوتا تھا۔تمام اہل خاندان خوش تھے کہ یہ عہدہ ملا
پرنسپل مسٹر بیک نے اس کی سفارش کی تھی لیکن اس نے اس پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔

"میں ہمیشہ طالب علم بن کر رہنا چاہتا ہوں اور یہ موقع مجھے کالج کی ملازمت کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا۔"

اس نے اپنے پرنسپل کو لکھ کر دے دیا کہ گورنمنٹ میں رپورٹ کر کے اس کا نام ڈپٹی کلکٹری سے خارج کرا دیا جائے۔

"ساٹھ روپے کی نوکری کے لیے ڈپٹی کلکٹری چھوڑ دی۔"

"میں مسلمان ریاضی دان ہوں' بنیا نہیں ہوں کہ اپنے علم کو پیسوں میں تولتا پھروں۔"

اس کی اس قربانی کا صلہ یہ ملا کہ کالج کے ٹرسٹیوں نے اس کی عارضی ملازمت کو

مستقل کر دیا اور تنخواہ سو روپے مقرر ہو گئی۔ سر سید احمد خان نے بطور خاص اسے شرف ملاقات بخشا۔ اس ملاقات میں نئی تقرری سے متعلق معاہدہ بھی زیر بحث آیا۔ سر سید نے معاہدے کا ایک مسودہ مرتب کیا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ کم از کم پانچ سال تک ملازمت ترک نہیں کریں گے۔

''آپ اس معاہدے کو پڑھ لیں اور اگر متفق ہوں تو اس پر دستخط کر دیں۔''

ضیاء الدین نے مسودہ پڑھا اور جواب دیا ''میرا مقصد تو علی گڑھ میں پوری زندگی صرف کرنے کا ہے مگر اس قسم کی پابندی میرے لیے عار ہو گی اور حقیقت میں کسی معاہدے کی بنا پر اس قومی ادارے میں رہنا بھی نہیں چاہیے۔''

سر سید اس کی اس سچائی سے اتنے متاثر ہوئے کہ مسودہ چاک کر دیا۔

''جاؤ کام کرو۔''

اس کی غیر معمولی استعداد اور ضبط اوقات کے ساتھ کارکردگی اور بہ حیثیت ایک استاد کے طلبہ کے ساتھ اس کی شفقت، دیکھتے ہی دیکھتے ضرب المثل بن گئیں۔ وہ ایک ایسا دماغ رکھتا تھا جسے انگریزی میں جینیس کہتے ہیں۔ ذہانت و فطانت کے علاوہ جسمانی توانائی اور چستی بھی اس غضب کی ملی تھی کہ لگاتار گھنٹوں کام کر سکتا تھا۔ انتقال ذہنی کی عجیب وغریب قوت تھی۔ ابھی ایک کام میں مشغول ہے، اس کے فوراً بعد ایک بالکل دوسرے قسم کا مسئلہ پیش آ گیا اور اس کا ذہن دوسرے مسئلے کی طرف منتقل ہو گیا۔ کمال یہ کہ اسی انہماک سے اس مسئلے پر غور کرنے لگا۔

اس عالی دماغی کے باوجود ایک طالب علم کا صحیح جذبہ بھی اس میں تھا۔ اگر کسی مضمون یا معاملے میں اسے پوری واقفیت نہ ہوتی تو کسی سے پوچھ لینے میں کوئی عار محسوس نہ کرتا۔

ایک مرتبہ اسے ریاضی کا کوئی مسئلہ پریشان کر رہا تھا۔ کئی ہفتے گزر گئے تھے لیکن حل نہیں مل رہا تھا۔ کسی نے کہا، اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی ریاضی اور اقلیدس میں علم

بے بدل رکھتے ہیں' ان سے رجوع کیجئے۔ اسے تعجب ہوا کہ دین و معرفت کا علم رکھنے والے احمد رضا خاں بھلا ریاضی کا علم کیا رکھتے ہوں گے؟ اگر کچھ جانتے بھی ہوں گے تو مجھ سے زیادہ کیا جانتے ہوں گے لیکن تشنگی نے راہ دکھائی اور وہ علی گڑھ سے بریلی پہنچ گیا۔ اعلیٰ حضرت کے آستانے تک پہنچ کر بھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ آ تو گیا ہوں لیکن گوہر مقصود شاید ہی ملے۔ یہ مسئلہ اگر اتنا ہی آسان ہوتا تو میں حل کر چکا ہوتا۔ جب مجھ سے حل نہ ہوا تو وہ کیا حل کریں گے۔ بہر حال' ملاقات کے بعد اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''میاں' آپ کی ریاضی دانی کی تو دھوم مچی ہوئی ہے۔ کہیں آپ میرا امتحان لینے تو نہیں آئے ہیں؟'' احمد رضا خاں بریلوی نے فرمایا:

''حضرت میری کیا مجال کہ آپ کا امتحان لوں۔''

''بھائی' تم پروفیسروں کو امتحان لینے کی عادت ایسی پڑ جاتی ہے کہ مجھے یہی گمان ہوا۔''

''میں تو طالب علم ہوں حضرت!''

''میں تو ریاضی کا طالب علم بھی کبھی نہیں رہا۔ خیر، میں دیکھتا ہوں کہ آپ سے یہ کیوں حل نہیں ہو رہا ہے۔''

اعلیٰ حضرت کچھ دیر غور کرتے رہے' پھر اس سوال کو حل کر دیا۔

''لیجئے صاحب، اللہ نے آپ کا مسئلہ حل کر دیا۔''

سوال حل ہو کر اس کے سامنے آیا تو بالکل آسان معلوم ہونے لگا۔ اب اسے خود تعجب ہو رہا تھا کہ یہ چھوٹی سی بات خود اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آسکی تھی۔

جب عالم شوق یہ ہو تو علم میں برکت کیوں نہ ہو۔ اس کے دستر خوان کا فیض جاری تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی علمیت اور علمیت سے بڑھ کر اس کے حسن سلوک نے اسے طلبہ میں مقبول بنا دیا۔

وہ علم کے حصول میں جتنا حریص تھا' علم کی تقسیم میں اتنا ہی فیاض تھا۔ اس کے گھر

کے دروازے طلبہ کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ اس میں علم کا شوق پیدا کرنے کا ایک خاص ملکہ تھا۔ کلاس میں لیکچر اس طرح دیتا کہ ریاضی جیسا خشک مضمون بھی دلچسپ معلوم ہونے لگتا تھا۔ جن طلبہ کو وہ دیکھتا کہ دلچسپی نہیں لے رہے ہیں' انہیں کسی نہ کسی طرح چائے پر بلا لیتا۔ یہ رشتہ ایک قسم کی دوستی میں بدل جاتا اور پھر وہ ان کی کوچنگ شروع کر دیتا۔ خاص طور پر امتحان کے زمانے میں اپنے ہزار کام چھوڑ کر وہ کمزور طلبہ کو امتحان کی تیاری کراتا۔ اس سے اگر ایک طرف یونیورسٹی کے رزلٹ پر خوش گوار اثر پڑا تو دوسری جانب طلبہ میں تعلیمی شوق پیدا ہوا۔

صرف دو سال میں اس نے اتنا اعتبار پیدا کر لیا کہ سر سید جیسے سخت گیر مشفق نے ۱۸۹۷ء کی بجٹ رپورٹ میں اس کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا۔

''جو ٹرسٹی کہ روزمرہ کے کالج کے حالات دیکھتے ہیں۔ وہ بخوبی واقف ہوں گے کہ ضیاء الدین احمد کے کالج میں ہونے سے طالب علموں میں کالج کا کس قدر علمی شوق بڑھتا جاتا ہے اور اس کا کالج میں رہنا طالب علموں کے لیے کس قدر مفید ہے۔ پس ایسی حالت میں ضیاء الدین احمد ٹرسٹیوں کی توجہ کا بہ لحاظ قومی ترقی و تعلیم کس قدر مستحق ہے اور جب موقع ملے گا ٹرسٹی ضرور اس کی ترقی پر توجہ فرمائیں گے۔''

یہ تحریر اس کے لیے ہزار ترقیوں سے بڑھ کر تھی۔ وہ کسی ترقی کی پروا کیے بغیر اپنی دھن میں مگن کالج کی ترقی کے لیے اپنی بساط سے بڑھ کر کام کرتا رہا۔

اس کے خلاق ذہن کی کوششوں سے چند ایسی اسکیموں پر کام شروع ہو سکا جو ابتک عدم توجہی کا شکار تھیں۔ ۱۸۸۷ء میں کالج میں سول انجینئرنگ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ رڑکی کے ابتدائی امتحان کے لیے طلبہ کو تیار کیا جائے مگر جب ضیاء الدین کالج میں آیا تو اس کا صرف نام ہی نام رہ گیا تھا۔ اس نے نہ صرف رڑکی کے امتحان کا بلکہ دہرہ دون کے محکمہء جنگلات کے امتحان مقابلہ کا بھی انتظام کیا۔ جو طلبہ اس امتحان میں شریک ہونا چاہتے تھے' ان کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی خود اس نے قبول کی

سرسید نے غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تھی جو بعد میں علی گڑھ منتقل ہو گئی تھی لیکن اب اس کا بھی صرف نام ہی نام رہ گیا تھا۔ضیاء الدین نے اسے پھر زندہ کیا۔ سائنسی آلات کالج میں منگوائے اور باقاعدہ ہفتہ وار جلسوں کے انعقاد کا انتظام کیا۔کالج میں سائنس کی تعلیم کا ابھی انتظام تو نہیں تھا لیکن ان جلسوں نے طلبہ میں سائنس کی تعلیم کا ذوق پیدا کیا اور دنیا میں ہونے والی سائنسی ترقیوں سے آشنا ہوئے۔

کالج کے تعلیمی ماحول کو بلند تر بنانے کے لیے اس کی کوششوں سے توسیعی لیکچروں کا انتظام ہوا۔اس اسکیم کے تحت ہر پروفیسر اپنے مضمون پر کم از کم بارہ لیکچر دینے کا پابند تھا۔ضیاء الدین نے اپنے لیے ''علم ہیئت'' کا موضوع منتخب کیا۔یہ علم قدیم مسلمان سائنس دانوں کا تو محبوب مشغلہ رہا تھا لیکن موجودہ مسلمان اس سے ناواقف تھے۔ان لیکچروں میں اس نے ایسی عام فہم زبان استعمال کی کہ یہ مشکل اور اجنبی مضمون طلبہ کے ذہنوں میں راسخ ہو گیا۔یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب لیکچر دینے والا اس علم کی باریکیوں سے پوری طرح واقف ہو چکا ہو۔اس نے ایک مضمون میں یہ ثابت کیا کہ جس طرح انسان کے دنیا میں گھومنے سے سمندر کی مچھلیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا' اسی طرح گردش نجوم سے انسان کی زندگی پر اثر نہیں پڑتا۔یہ بالکل وہی خیالات تھے جو عمر خیام کہا کرتا تھا۔

۱۸۹۷ء میں پروفیسر آرنلڈ مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے جو انگریزی' تاریخ اور منطق پڑھاتے تھے۔اس وقت کالج بجٹ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ کسی نئے پروفیسر کا بندوبست کیا جاتا۔یہ فیصلہ ہوا کہ ان کے مضامین موجود پروفیسروں میں تقسیم کر دیئے جائیں لیکن مصیبت یہ تھی کہ منطق پڑھانے پر کوئی بھی تیار نہیں تھا۔اس مضمون کو ترک بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ الٰہ آباد یونیورسٹی نے اس مضمون کو ایف اے میں لازمی قرار دے دیا تھا۔

''مسٹر ضیاء الدین! آپ کا ذہن اس مضمون کے لیے بہت مناسب ہے۔یہ مضمون آپ پڑھائیے'' پرنسپل بیک نے کہا۔

”سر! میں نے یہ مضمون کبھی پڑھا ہی نہیں۔ میں کیسے پڑھا سکتا ہوں؟ یہ تو ایک قسم کی سائنس ہے۔ محض پڑھ لینے سے تو نہیں پڑھایا جا سکتا۔“

”مجھے معلوم ہے، آپ پڑھا سکتے ہیں۔ بس آپ تیاری کیجئے، آپ ہی پڑھائیں گے۔“

حکم کی بجا آوری تو کرنی تھی اور پھر طلبہ کا مفاد بھی پیش نظر تھا لیکن وہ پریشان تھا کہ جس مضمون کو اس نے پڑھا ہی نہیں ہے۔ اسے وہ کالج کی سطح پر پڑھائے گا کیسے؟ اس پریشانی کے باوجود اسے اپنی ذہنی صلاحیتوں پر اعتماد بھی تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو اس طرح تربیت دی تھی جیسی تربیت ایک سپاہی یا کھلاڑی کو دی جاتی ہے۔ اس کا ذہن اس کے حکم پر چلتا تھا۔ جس وقت چاہتا' وہ کسی چیز کو یاد کر لیتا' جس وقت چاہتا بھلا دیتا۔ اسے اپنے ذہن پر اتنا قابو ہو گیا تھا کہ جب اور جتنی دیر چاہتا سو لیتا اور پھر اٹھ بیٹھتا۔ جس کتاب کو پڑھتا' اس کی گہرائی میں اتر جاتا پھر اسے ایسا عبور ہو جاتا کہ خود کتاب لکھنے والوں کو بھی کیا ہو گا۔

اس نے منطق پر کتابیں جمع کیں اور انہیں پڑھنا شروع کر دیا۔ بڑی محنت کے بعد نوٹس بنائے اور پڑھانے کے لیے کلاس میں پہنچ گیا۔ چند لیکچروں کے بعد تو یہ عالم ہو گیا کہ وہ ریاضی سے منطق کا پروفیسر معلوم ہونے لگا۔ اس کے پڑھائے ہوئے شاگرد' امتحان میں شاندار نمبروں سے پاس ہوئے۔ مسٹر وینس' پرنسپل کوئن کالج بنارس ممتحن کے فرائض انجام دے رہے تھے، انہیں یہ کہنا پڑا کہ منطق کی بہترین تعلیم علی گڑھ میں ہوتی ہے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ پڑھانے والا ریاضی کا پروفیسر ہے تو انہیں بے انتہا تعجب ہوا۔

ان تعلیمی سرگرمیوں سے قطع نظر اس کے خلوص نے اسے بعض انتظامی نوعیت کے کاموں میں بھی مصروف کر دیا۔ دراصل علی گڑھ اس کی تمناؤں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ علی گڑھ ہی وہ ادارہ بن سکتا ہے جو مسلمانوں کی عزت کا باعث بنے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب زیادہ سے زیادہ طلبہ یہاں پڑھنے آئیں اور مخیّر حضرات اس ادارے کی مالی امداد کے لیے ہاتھ بڑھائیں۔ محض گورنمنٹ کی گرانٹ سے اخراجات پورے نہیں

ہو سکتے۔ اس سلسلے میں سب سے قابل قدر خدمات وہ تھیں جو اس نے ''انجمن الفرض'' کی ترقی کے لیے انجام دیں۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کے ذریعے سے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف مائل کیا جائے اور ان شکوک کو دور کیا جائے جو انگریزی تعلیم کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں ہیں نیز کالج اور تعمیر مسجد کے لیے چندہ جمع کیا جائے۔

جب محمڈن کالج کا سالانہ اجلاس شاہ جہاں پور میں منعقد ہوا تو ضیاء الدین نے عجیب طریقہ اختیار کیا۔ اس نے اس کانفرنس کے موقع پر چائے کا اسٹال کھولا اور نشستوں کا معقول انتظام کیا۔ ایک میز پر تازہ اخبار اور رسالے رکھے۔ اسی جگہ کانفرنس کے ممبران کی ڈاک کا انتظام تھا۔ ممبران کانفرنس کو خریداری کے لیے نہیں تو اخبار پڑھنے یا ڈاک دیکھنے دکان پر آنا پڑتا اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ دکان ایک پروفیسر نے کھولی ہے تو وہ کچھ نہ کچھ خرید بھی لیتے اور کچھ عطیہ بھی دیتے۔ یہ انتظام اتنا شاندار ثابت ہوا کہ اسے اسسٹنٹ کیپر کا عہدہ مل گیا۔ کالج کا پرنسپل کیپر کہلاتا تھا۔ ابھی تک طلبہ انفرادی طور پر چندہ جمع کرتے تھے۔ اس نے کیپر (اسسٹنٹ) کے عہدے پر فائز ہوتے ہی طلبہ کے وفود ترتیب دیے اور ملک کے مختلف حصوں میں انہیں روانہ کیا۔

اس کی ان کوششوں سے ایسی عظیم الشان تبدیلیاں رونما ہوئیں جس سے کالج کی شہرت اور آمدنی میں اضافہ ہوا۔ اب تک اس ''انجمن الفرض'' کی شہرت کالج کی دیواروں تک محدود تھی، ضیاء الدین نے اسے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا اور سینکڑوں نہیں ہزاروں ہمدردان کالج کا اضافہ کیا۔

اس کی مصروفیات اس کی شہرت میں ضرور اضافہ کر رہی تھیں لیکن اس کی منزل کچھ اور تھی۔ وہ روز کھلے آسمان کے نیچے سونے کے لئے لیٹتا تو دو خیال ایک ساتھ اس کے ذہن میں آتے۔ ''میری قوم بھی ان ستاروں کی طرح بکھری ہوئی ہے۔ اگر ان کا یہ انتشار دور ہو جائے تو ترقی کی نئی راہیں ان پر کھل جائیں۔ مسلمانوں کا ذہنی مرکز علی گڑھ کالج کا ادارہ ہے لیکن تمام مسلمان اس ادارے پر ہی متفق نہیں ہیں۔ انگریزی تعلیم ہماری اقتصادی حالت کو

بہتر بنا سکتی ہے لیکن لوگ ابھی تک انگریزی سے دور بھاگ رہے ہیں۔ چند بڑے گھرانے اس طرف متوجہ ہوئے ہیں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ بات تو عوام الناس کی ہے۔

دوسرا خیال یہ آیا کہ وہ کسی طرح ان ستاروں کو شمار کر لے۔ اس بچگانہ خواہش پر اسے ہنسی آئی لیکن پھر وہ سنجیدہ ہو گیا۔ شمار کا تعلق ریاضی سے تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ کالج کے انتظامی معاملات میں اس قدر پھنس گیا ہے کہ اپنے مضمون کی طرف سے غافل ہوتا جا رہا ہے۔ صرف بی اے تک تو کوئی تعلیم نہیں ہوتی۔ اس کی انتظامی صلاحیتوں سے ادارے کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ بے شک یہ قوم کا بھی فائدہ ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی بات میں اس وقت زیادہ اثر ہو سکتا ہے جب وہ اپنی ذات کو مثال بنائے۔ اس کے لیے اسے تحقیق کے نئے میدانوں میں سفر کرنا ہوگا۔

انہی دنوں ایک طالب علم سخت بیمار پڑ گیا، اقامتی عمارت میں ان دنوں مریض طلبہ کی دیکھ بھال کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ان کی تیمارداری اور علاج معالجے کی سہولت' زیادہ تر اسٹاف اور دیگر اصحاب کی ہمدردی پر منحصر تھی۔ ضیاء الدین اس کارِ خیر میں سب سے آگے رہتا تھا۔

اس طالب علم کی بیماری نے کچھ ایسا طول کھینچا کہ وہ اسے اپنے مکان پر لے آیا۔ مکان کیا تھا' یونین کلب کے قریب ایک بنگلا تھا اس کے ایک کمرے میں وہ مقیم تھا۔ یہی بیڈ روم تھا' یہی ڈرائنگ روم۔ (یہ ابتدائی زمانے کی بات ہے۔ بعد میں انہوں نے شاندار زندگی گزاری اور جائداد بنائی)۔ اس طالب علم کی انہوں نے اس شفقت سے تیمارداری کی کہ اس کا متاثر ہونا لازمی تھا۔

''سر آپ اپنا قیمتی وقت مجھ پر کیوں خرچ کر رہے ہیں؟ یہی وقت اگر آپ اپنے اوپر خرچ کریں تو آپ کو کتنا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔''

اس لڑکے نے نہ جانے کس جذبے کے تحت یہ بات کہہ دی۔ وہ تو کہہ کر خاموش ہو گیا لیکن ضیاء الدین بہت دیر تک سوچتا رہا، وہ ایک مرتبہ پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ قومی

کاموں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اسے اپنی تعلیم کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی تو ایک قومی کام ہوگا۔ میں اپنی تعلیمی ترقی سے مسلمانوں کی ناموری کا باعث بھی بن سکتا ہوں اور اس علم سے اپنی قوم کو فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔

اس نے پرائیویٹ طور پر تیاری شروع کر دی۔ پہلے کلکتہ یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم اے کیا اور پھر اسی یونیورسٹی سے ڈی ایس سی کا امتحان دیا۔ ہر امتحان میں اپنی روایت کے مطابق درجہ اول میں کامیاب ہوا۔

کسی مسلمان کا ریاضی میں اتنی اور ایسی اعلیٰ کامیابی حاصل کرنا عجائبات میں سے تھا۔ اس کی اس کامیابی نے تمام مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔

☆☆☆

کالج کی آمدنی بڑھانے کے لیے کوششیں برابر جاری تھیں۔ نواب محسن الملک اور خود ضیاء الدین، مخیّر حضرات کی توجہ مبذول کرانے کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہے تھے۔ نواب محسن الملک کو اس وقت ایک بڑی کامیابی ہوئی جب ہز ہائی نس آغا خان کی توجہ کالج کی طرف مبذول کرانے میں وہ کامیاب ہوئے۔ انھوں نے تین ہزار سالانہ کی امداد کالج کے لیے منظور کی۔ دوران گفتگو ضیاء الدین کا ذکر بھی نکل آیا۔

''جناب، یہ نوجوان ہمارے کالج کی کان میں ترشے ہوئے ہیرے کی طرح ہے'' محسن الملک نے کہا ''ضیاء الدین احمد مسلمانوں پر جان دینے والا شخص ہے جس کو ڈپٹی کلکٹری ملتی تھی لیکن اس نے محض قومی بھلائی کے خیال سے اس نوکری کو نامنظور کیا۔ سو روپے کی نوکری پر پڑا ہوا ہے۔ اگر ڈپٹی کلکٹر ہوتا تو اس وقت پانچ سو کی تنخواہ ہو جاتی۔''

''یہ واقعی اس کا قومی جذبہ ہے'' آغا خان نے کہا۔

''اس کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے'' محسن الملک نے پھر کہا ''صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ سرسید کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں ہو لیکن تیرہ سال تک کامیابی نہیں ہوئی، بالآخر ضیاء الدین وہاں گئے۔ تین ہفتوں تک وہاں پڑے

رہے۔ مسلمانوں کی نا اتفاقی کو ختم کرایا اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ منعقد ہوا۔ وہ کم عمر ہے لیکن بڑے کام کا ہے۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ بھی ایسا ہے کہ مسلمانوں کے سر فخر سے بلند ہو گئے ہیں۔ ریاضی میں اس وقت اس کے معیار کا کوئی آدمی نہیں۔''

''ایسے آدمی کو تو تعلیم حاصل کرنے کے لیے ملک سے باہر جانا چاہیے'' آغا خان نے کہا۔

''اس کے اخراجات وہ شاید برداشت نہ کر سکے۔''

''حکومت کی طرف سے کوئی وظیفہ نہیں ملا؟''

''اسٹیٹ اسکالر شپ کا وظیفہ ملا تو ہے لیکن یہ وظیفہ محدود مدت کے لیے ہے اور وہ شاید زیادہ عرصہ قیام کرنا چاہے۔''

''تین ہزار روپے سالانہ کی جو رقم میں نے کالج کے لیے منظور کی ہے' اس کا نصف ضیاء الدین کا وظیفہ سمجھ لیا جائے تا کہ وہ سرکاری مدت معینہ سے زیادہ یورپ میں رہ کر مزید قابلیت حاصل کر سکے۔''

اسٹیٹ اسکالر شپ کا اعلان ہوتے ہی اس نے باہر جانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، لیکن گھر والوں نے اس کی شادی کرنا ضروری سمجھا کہ کہیں وہ وہاں جا کر شادی نہ کر لے۔ شادی کے بعد لوگ ہنی مون پر جاتے ہیں' وہ نو بیاہتا بیوی کو چھوڑ کر تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ کے سفر پر روانہ ہوا۔

اس کی روانگی کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ یورپ تو سبھی جاتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی متعدد مسلمان طلبہ جا چکے تھے، لیکن ان کا مقصد محض اسناد کا حصول تھا جبکہ اس کے نتیجۂ سفر پر سب کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے مستقبل میں قوم کے مستقبل کی شاندار امیدوں کی خوش کن جھلک بھی تھی۔ کئی دن پہلے سے دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ روانگی کے وقت طلبہ نے ایڈریس پیش کیا جس میں اس کی خدمات کا اعتراف پیش کیا گیا تھا۔

وہ علی گڑھ سے رخصت ہو کر بمبئی پہنچا۔ بمبئی سے پیرس گیا اور وہاں دو دن قیام

کرنے کے بعد انگلستان پہنچ گیا۔ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں اس نے ٹرنٹی کالج میں داخلہ لے لیا جو کیمبرج یونیورسٹی میں سب سے بڑا کالج تھا۔ وہ ڈی۔ ایس۔ سی کر کے آیا تھا اس لیے اس کا ایک سال بچ گیا۔ اسے آنرز کے دوسرے سال میں داخلہ ملا اور یہ دو سال بھی اس نے اس شاندار کارکردگی سے گزارے کہ جب رزلٹ آیا تو اس سال کے گریجویٹوں میں اس کا نمبر سب سے اوپر تھا۔ اس کے بعد اس نے سر آئزک نیوٹن اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے کوشش شروع کر دی۔ یہ دو سو پاؤنڈ سالانہ کا وظیفہ تھا جو تین سال تک جاری رہتا تھا۔ اس نے ایک سال کی محنت شاقہ کے بعد یہ وظیفہ حاصل کر لیا۔ وہ اولین ہندوستانی تھا جس نے یہ وظیفہ حاصل کیا تھا۔

وہ ملک سے باہر رہ کر بھی علی گڑھ کو نہیں بھولا تھا۔ علی گڑھ کی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے اس نے علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ اس ایسوسی ایشن کے تحت سالانہ جلسہ اور ڈنر کا اہتمام کیا۔ ریٹائرڈ حکام، ہمدردان کالج اور خاص اصحاب مدعو کیے گئے۔ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک اور کالج پر تقریریں ہوئیں۔ اس کی دوسری دلچسپی مسلمان سائنس دانوں میں تھی۔ اس جذبے کے تحت ایک مسلم سوسائٹی قائم کی جس میں ہفتے میں دو مرتبہ کسی مشہور مسلمان کی زندگی اور کارناموں پر مضامین پڑھے جاتے تھے۔

وہ فارسی سے تو واقف تھا لیکن عربی سے نابلد تھا جب کہ ہیئت اور ریاضی کی حقیقی تکمیل اس کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ عرب علما کی تصانیف سے استفادہ کرنے کے لیے عربی زبان کا سیکھنا ضروری تھا۔ اس کے لیے وہ پروفیسر براؤن کے درس میں شامل ہونے لگا اور اپنے ذہن کی اعلیٰ ساخت کی بدولت چند مہینوں میں ضرورت کے مطابق اس زبان کو حاصل کر لیا۔ عربی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان کو بھی سیکھنا شروع کیا۔

ریاضی اور ہیئت اس کے خاص مضمون تھے مگر فزکس میں بھی ایک نامور پروفیسر کے متعدد لیکچروں میں شریک ہونے لگا۔ چند ہی روز میں ایسی قابلیت کا مظاہرہ کیا کہ یونیورسٹی نے انہیں پروفیسر لیبر زفوڈ کے مددگار کے طور پر منتخب کر لیا۔ اپنے قیام کے تیسرے

سال اس نے ٹیچرز ٹریننگ کا پورا کورس ختم کر لیا جس میں تعلیم کی تاریخ اور اسکول کے انتظام پر لیکچر ہوتے تھے۔

حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ اس نے مضامین لکھنے کا بھی آغاز کیا۔ وہاں کے نظام تعلیم کا موازنہ ہندوستان کے نظام تعلیم سے کیا اور نتائج کو مضامین کی شکل میں اردو میں تحریر کیا۔ ان مضامین کو ہندوستان بھیجا جو ''البشیر'' نامی اخبار میں شائع ہوتے رہے۔

یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک پیاسا' دریا کے کنارے آکر کھڑا ہو گیا ہے اور چاہتا ہے کہ اس دریا کا ایک ایک قطرہ پی جائے۔

اس شدید محنت نے اس کی صحت کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نیند نہ آنے کے مرض کا شکار ہو گیا۔ جب سونے کا ارادہ کرتا تو زیر غور ریاضی کا کوئی مسئلہ اس کے دماغ میں گھومنے لگتا اور نیند اڑ جاتی۔ دو ہفتے اسی عالم میں گزر گئے تو اس نے ٹیوٹر سے شکایت کی اس نے ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔

''آپ فوراً ہندوستان واپس چلے جائیں۔ ایسی حالت میں خرابی دماغ کا اندیشہ ہے۔ کوئی تدبیر بجز واپسی کے موثر نہیں ہو سکتی'' ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔

اس کی غیرت علمی کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ راستے سے لوٹ جائے۔ یہاں کی یونیورسٹیوں میں ہر طرف علم ہی علم بکھرا ہوا تھا۔ وہ ہر کتاب کے ہر ورق پر اپنی آنکھوں کے نقوش چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے مشورے کو بالائے طاق رکھا اور اپنا علاج خود شروع کر دیا۔ سارا کھیل دماغ کا تھا اور دماغ کو وہ پہلے ہی اپنا محکوم کر چکا تھا۔ اب صرف حکم دینے کی دیر تھی۔ اس نے ایک کتاب کھولی اور عبارتوں کے ہجوم میں گم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ کتاب کا وجود بھی درمیان سے ہٹ گیا۔ اب وہ تھا اور ریاضی کے جدید تر مسائل۔ خود رفتگی کے اس عالم میں گھنٹوں گزر گئے پھر اس نے ایک منصوبے کے تحت کتاب کو بند کر دیا اور اپنے ذہن کو ان مسائل سے ہٹنے کا حکم دیا۔ جیومیٹری کی آڑھی ترچھی لکیریں' کتاب سے نکل کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ

لکیریں ان اندھیروں میں بھی چلی آئیں۔اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔اس نے کچھ اور سوچنے کی کوشش کی۔یہ لکیریں کبھی غائب ہو جاتیں کبھی سامنے آجاتیں۔وہ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے کمرے سے باہر نکل آیا۔ریاضی کے کئی فارمولے جن پر وہ غور کرتا رہا تھا' اس کیساتھ ساتھ کمرے سے نکلے۔وہ انہیں جھڑک دیتا' وہ پیچھے رہ جاتے لیکن پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے۔کئی دن کی کوشش کے بعد پیچھے رہ جانے اور ساتھ چلنے کے درمیانی وقفے طویل ہونے لگے۔

کئی ہفتوں کی مسلسل مشق کے بعد اس کا ذہن پوری طرح اس کا حکم ماننے لگا۔ جب وہ چاہتا ان مسائل پر سوچنے لگتا جب چاہتا انہیں بھلا دیتا۔کتاب بند کرتے ہی ریاضی کے مسائل سے دماغ خالی ہو جاتا اور دوبارہ کتاب کھولتے ہی مسائل پوری طرح ذہن میں آجاتے۔اس نے قوت خیال سے اپنا علاج خود کرلیا تھا،اب اس کو اچھی طرح نیند بھی آنے لگی تھی۔اس نے اپنی اس کیفیت کو اپنے ڈاکٹر کے سامنے بیان کیا۔ڈاکٹر کو انتہائی تعجب ہوا۔

''آپ زبردست قوت ارادی کے مالک ہیں۔آپ نے اپنا علاج خود کر لیا۔اب آپ کو ہندوستان واپس جانے کی ضرورت نہیں۔''

اس نے اب اپنے ذہن کو مزید قابو میں رکھنے کے لیے زندگی کی بعض دلچسپیوں میں شریک ہونا شروع کر دیا۔اس نے بوٹنگ کلب جوائن کیا اور کشتی رانی سیکھنے لگا۔اس کا ایک ٹیوٹر جو اسی کا ہم عمر تھا' کشتی رانی میں اکثر اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ایک دن کشتی میں سیر کرتے ہوئے اس نے ریاضی کا کوئی مسئلہ چھیڑ دیا اور ضیاء الدین کی رائے جاننا چاہی لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ضیاء الدین تو اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔

''ابھی کل ہی تو اس مسئلے پر آپ سے بات ہوئی تھی۔آپ نے کئی اچھے دلائل دیئے تھے بلکہ ایک موقع پر تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آپ اسے حل کر لیں گے۔'' اس کے ٹیوٹر نے کہا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' ضیاء الدین نے کہا ''اگر اس مسئلے پر آپ سے میری بات ہوئی ہوتی تو اس وقت ضرور یاد آجاتا۔''

''مجھے لگتا ہے' آپ نسیان کے مرض میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں، جیسا کہ ریاضی کے اکثر طالب علموں کے ساتھ ہوتا ہے'' اس کے ٹیوٹر نے کہا۔

''آپ تو یہ دیکھئے کہ میں کتنی اچھی کشتی چلانے لگا ہوں۔'' ضیاء الدین نے کہا۔

جب وہ اپنے ٹیوٹر کے ہمراہ کلب سے باہر نکلا تو اچانک وہ مسئلہ اسے یاد آگیا اور اس نے اپنے ٹیوٹر سے اس پر سیر حاصل گفتگو کی۔ گویا اب اسے یہ قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ ایک کام کرتے ہوئے دوسرے کام کا خیال تک نہ آئے۔

ابھی وہ حافظے اور نسیان کی اس دھوپ چھاؤں میں سفر کررہا تھا کہ گھر سے ایک اندوہناک خبر آگئی۔ اس کی بیوی کا ہندوستان میں اچانک انتقال ہوگیا تھا۔ وہ اپنی مصروفیات میں تقریباً بھول چکا تھا کہ اس کی کوئی بیوی بھی ہے۔ گھر سے اس کی موت کا تار آیا تو وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگا لیکن اپنے مشن کو ادھورا چھوڑ کر واپس نہیں جاسکتا تھا' جا کے کرتا بھی کیا؟

اسے اب اپنے ذہن پر قدرت پانے کا ہنر آگیا تھا۔ خود کو مصروف رکھنے کے لیے اس نے شطرنج کھیلنی شروع کردی۔ یہ کھیل اس کی ذہنی ساخت کے اتنا قریب تھا کہ تھوڑے ہی وقت میں اس درجہ کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے کھلاڑیوں سے مقابلے کئے اور ایک مقابلے میں تو ایسی چال نکالی جو اسی کے نام سے موسوم ہوگئی۔

وہ ابھی ہندوستان واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن بار بار ایسے حالات پیدا ہوجاتے تھے کہ اس کی واپسی ضروری نظر آنے لگتی تھی۔ اس مرتبہ یہ ہوا کہ سرکاری اسکالرشپ کی مدت جو تین سال تھی، ختم ہوگئی' جبکہ وہ ابھی کئی اور تعلیمی معرکے سر کرنے کا خواہش مند تھا۔

اس نے اپنے اساتذہ سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا۔ کیمبرج کے اساتذہ نے

اسکالرشپ کی مدت میں توسیع کی پرزور سفارش کی۔لارڈ جارج ہملٹن سیکریٹری آف اسٹیٹ تھے۔وہی اسکالرشپ کی مدت میں توسیع کر سکتے تھے۔ان کے پاس یہ سفارش ایسے لفظوں میں پہنچی۔کیمبرج کے اساتذہ نے اس کی ایسی تعریف کی تھی کہ انہیں اس ہندوستانی نوجوان کو دیکھنے کا اشتیاق ہوگیا۔انہوں نے بالمشافہ ملاقات اور گفتگو کے بعد توسیع کر دی۔

اسکالرشپ کی مدت میں توسیع کا حکم ملتے ہی وہ جرمنی چلا گیا اور گوٹنجن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔یہاں اس کے مضامین ریاضی، فزکس اور ہیئت تھے۔علم ہیئت پر اس نے خاص توجہ کی اور اسے اپنا خاص مضمون بنا لیا۔اس نے محض ایک سال کی مدت میں پی ۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔اس ڈگری کے حصول کے بعد وہ پیرس چلا گیا اور پیرس یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔اس یونیورسٹی میں اسے چند اساتذہ کے لیکچر سننا نصیب ہوئے جو دنیا میں مستند سمجھے جاتے تھے۔فرانس سے فارغ ہونے کے بعد چند مہینے اٹلی کی بولوگنا یونیورسٹی میں گزارے جو جیومیٹری کی تعلیم میں درجہ امتیاز رکھتی تھی۔

انیسویں صدی کے آخر تک تمام دنیا میں اقلیدس پڑھائی جاتی تھی اور اسی کو لوگ جیومیٹری کہتے تھے لیکن ۱۸۷۰ء میں یہ تحقیق ہوئی کہ اقلیدسی دلائل سے بلا صحیح اشکال بنائے ہوئے غلط نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے۔مغرب کے تمام اساتذہ کی یہ خواہش تھی کہ اقلیدس کی جگہ جدید جیومیٹری پڑھائی جائے لیکن وہ پروفیسر جو اقلیدس میں مہارت رکھتے تھے اس خیال کی مخالفت کر رہے تھے۔

۱۸۷۴ء میں ریاضی کا مشہور پروفیسر کریمونا اٹلی میں وزیر تعلیم ہوگیا۔اس نے ایک سرکاری حکم کے تحت اقلیدس کی تعلیم بند کر کے جدید جیومیٹری رائج کر دی اور اس طرح اٹلی جدید جیومیٹری کی تعلیم کا مرکز بن گیا۔

ہندوستان میں بھی اقلیدس پڑھائی جاتی تھی۔ضیاء الدین نے خود اسے پڑھا

تھا۔اب وہ چاہتا تھا جدید جیومیٹری سیکھے اور جب ہندوستان واپس جائے تو اقلیدس کی جگہ جیومیٹری کو رائج کرے۔ یہی خواہش لے کر وہ اٹلی آیا تھا۔

☆☆☆

وہ عاشق علم دشت نوردی میں مصروف تھا کہ اس کا سفر روکنے کے لیے دام بچھائے جانے لگے۔

اس کے کیمبرج کے ایک ٹیوٹر ہندوستان میں آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔انہیں اپنے اسسٹنٹ کے طور پر اسامی پر کرنی تھی۔انہیں ضیاءالدین کا خیال آیا جو اب ڈاکٹر ضیاءالدین ہو چکا تھا۔انہوں نے خط لکھ کر اسے فوراً ہندوستان آنے کی دعوت دی۔وہ کسی سرکاری ملازمت کے بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔اس نے تو ڈپٹی کلکٹری کو اہمیت نہیں دی تھی، چار سو روپے ماہانہ کی اس نوکری کو کیا اہمیت دیتا۔اس نے خط لکھ کر معذرت کر لی۔بار بار کے اصرار کے باوجود وہ اس نوکری کے تیار نہ ہوا۔

اسے زیر دام لانے کے لیے ایک اور کوشش سر جیمس لاٹوش لیفٹیننٹ گورنر صوبہ متحدہ نے کی۔ضیاءالدین کی شہرت سن کر انہیں خیال ہوا کہ اس شخص کو ہندوستان میں انسپکٹر اسکول کے عہدے پر مقرر ہونا چاہیے۔یہ عہدہ تعلیم سے متعلق تھا اور تنخواہ بھی ۷۵۰ روپے ماہانہ۔جیمس لاٹوش کو امید تھی کہ ضیاءالدین اس ملازمت کو ٹھکرائیں گے نہیں۔انہوں نے ایک زوردار خط کے ذریعے اسے اس ملازمت پر مائل کرنے کی کوشش کی۔ضیاءالدین نے اس سے بھی زوردار خط کے ذریعے معذرت کر لی۔ساتھ ہی یہ لکھ دیا کہ اب جو بات بھی کیجائے، اس کے بجائے نواب محسن الملک سے کی جائے جو فیصلہ ان کا ہوگا وہی میرا ہوگا۔ساتھ ہی اس نے محسن الملک کو بھی پیغام بھیج دیا کہ موجودہ اور آئندہ ہر قسم کی ملازمت کے لیے میری طرف سے آپ جواب دیجیے۔

اس کا خط ملنے کے بعد جیمس لاٹوش نے ضروری سمجھا کہ وہ نواب محسن الملک سیکریٹری علی گڑھ کالج سے رجوع کریں۔جیمس لاٹوش کا استدلال یہ تھا کہ چونکہ ضیاءالدین

سرکاری وظیفے پر یورپ گئے ہیں اس لیے مقدم حق گورنمنٹ کا ہے۔ محسن الملک کا استدلال یہ تھا کہ ضیاء الدین کے یورپ جانے میں ہز ہائی نس آغا خان کے وظیفے کا بھی دخل ہے اور پھر یورپ جا کر اس نے نیوٹن اسکالرشپ بھی حاصل کی ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سرکاری وظیفے پر یورپ گئے ہیں اور نہ ہی گورنمنٹ سے کوئی معاہدہ ہوا تھا۔

سر جیمس لاٹوش سے ملاقات کے بعد محسن الملک کو یہ فکر ہونے لگی تھی کہ کہیں کسی پیش کش کا جادو چل ہی نہ جائے اور ضیاء الدین ان کے ہاتھ سے چلے جائیں۔ اب وہ اصرار کرنے لگے کہ اسے ہندوستان واپس آ جانا چاہیے۔ انہوں نے کئی خطوں کے بعد ایک مزے دار خط لکھا۔

''اب آپ برائے مہربانی سر آئزک نیوٹن ہونے کے خیال اور زیادہ یورپ میں رہنے کا ارادہ نہ کیجئے۔ ہم کو ایک مسلمان نیوٹن مل گیا' اب ہمیں کچھ اور نہیں چاہیے۔''

جب محسن الملک کا اصرار حد سے بڑھنے لگا تو انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا۔ مصر کی یونیورسٹی جامعہ ازہر کا بڑا شہرہ تھا لہذا اس نے مصر میں کچھ دن قیام کے بعد ہندوستان واپسی کا پروگرام بنایا۔ مصر پہنچتے ہی اس نے شیخ الجامعہ سے ملاقات کی اور ہیئت کے اساتذہ سے ملا۔ اسے یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ مصر تعلیمی طور پر پسماندہ ہے۔ انگریزی اقتدار' مصر کی ترقی میں مانع ہو رہا ہے۔ اہل قلم اور اکابرین سے ملاقات کے بعد بھی وہ اسی نتیجے پر پہنچا۔ مصر کے اخبارات کے اصرار پر اس نے ہندوستان' مصر اور یورپ کی تعلیم پر کئی مضمون لکھے جو اخبارات میں شائع ہوئے۔ ان مضامین میں اس نے صاف لکھا۔

''اس وقت مسلمانان ہند دیگر ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور اگر دنیا کے مسلمان کسی وقت ترقی کریں گے تو مسلمانان ہند ہی اس ترقی کا باعث ہوں گے اور علی گڑھ اس ترقی کا مرکز ہوگا۔''

ان مضامین کی اشاعت سے عام لوگوں کو اس کی آمد کا علم ہوا۔ اپنے درمیان اتنے بڑے مسلمان عالم کو دیکھ کر شوق ملاقات بڑھنے لگا چنانچہ بعض دوستوں کے اصرار پر وہ

پبلک ہال میں لیکچر دینے پر تیار ہو گیا۔تمام نشستیں بھر چکیں تھیں۔لوگ کھڑے ہو کر اس کا لیکچر سن رہے تھے۔جوش اور ولولہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔اس کے لیکچر کا موضوع اگرچہ صرف تعلیم اور مصر کی پسماندگی تھا لیکن لہجہ بے حد سخت تھا۔غضب یہ بھی ہوا کہ اس نے تجزیہ کرتے ہوئے مصر کی تعلیمی پسماندگی کو برطانوی پالیسی قرار دیا۔

اس کے خیالات مصری عوام کی ترجمانی کرتے تھے لہذا دوسرے دن کے اخبارات اس لیکچر کی روداد سے بھرے پڑے تھے۔اسی طرح کے اس نے کئی لیکچر اور بھی دیے۔اخباروں نے ہر لیکچر کو بڑی آب وتاب سے شائع کیا۔جس وقت اس کے لیکچروں کی دھوم مچی ہوئی تھی اس وقت برٹش ہائی کمشنر لارڈ کرومر مصر میں نہ تھے۔جب ایک مہینے بعد وہ آگئے تو ضیاء الدین ان سے ملاقات کے لیے گیا۔وہ بڑے خلوص سے ان سے ملنے گیا تھا لیکن وہ اس کے لیکچروں کی دھوم سن چکے تھے اور اتنے برہم تھے کہ اگر وہ نہ پہنچتا تو وہ خود اسے بلواتے۔انہوں نے بیٹھتے ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''آپ یہاں علمی لیکچر دینے آئے تھے یا سیاسی آگ لگانے؟''

''میں نے ایسا تو کچھ نہیں کیا۔''

''آپ نے جو لیکچر دیے ہیں' ان سب کی رپورٹ مجھے مل چکی ہے۔''

''میں نے ان لیکچروں میں کوئی غیر اخلاقی بات نہیں کہی۔''

''غیر اخلاقی بات نہیں کی، لیکن برطانوی حکومت سے وفاداری کا ثبوت بھی نہیں دیا۔''

''میں اس کا پابند نہیں تھا میں نے جو کچھ کہا' وہ میری ایماندارانہ رائے تھی۔میں اپنے خیالات کے اظہار میں کسی کا پابند نہیں ہوں۔''

گفتگو میں اب ایسی تیزی آ گئی تھی کہ ضیاء الدین کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔لارڈ کرومر کو بھی اس سے ایسی توقع نہیں تھی۔

''یہ مت بھولیے کہ آپ کو ہندوستان جانا ہے اور وہاں برٹش راج ہے۔''

''آپ مجھے دھمکا رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''معاف کیجئے گا' میں ہندوستان میں رہتا ضرور ہوں لیکن میں وہاں کی سرکار کا نوکر نہیں ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میں سرکاری نوکری کا اہل نہیں بلکہ اس لیے کہ میں سرکار کی نوکری اپنی توہین سمجھتا ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ!'' لارڈ کرومر نے کہا ''آپ کے یہ خیالات ہندوستان میں اعلی حکام تک پہنچا دیے جائیں گے۔''

اس کے بعد کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ وہاں رکتا۔ اس نے بادل ناخواستہ لارڈ سے مصافحہ کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ بات یہیں رہنے والی نہیں تھی۔ اس کے اٹھتے ہی انہوں نے وزیر خارجہ مسٹر بیلفورڈ کو شکایت لکھی اور انہوں نے وائسرائے ہند لارڈ منٹو کو مطلع کیا۔

''اس شخص (ضیاء الدین) کے خیالات باغیانہ ہیں۔ ہندوستان پہنچتے ہی اس کی خاص نگرانی کی جائے۔''

ضیاء الدین اس خفیہ کاروائی سے بے خبر' چند ہفتے مصر میں ٹھہرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہوا اور دسمبر ۱۹۰۶ء کو علی گڑھ اسٹیشن پر اترا۔ دور دور تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ کالج اور اسکول کے طلبہ کے نعروں سے پلیٹ فارم گونج رہا تھا۔ محسن الملک کی ہمراہی میں پرنسپل اور اسٹاف کے ممبران اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ کارپردازان حکومت ہزار مرتبہ علی گڑھ آئے ہوں گے لیکن اتنی آنکھیں کسی کو دیکھنے کی مشتاق نہیں ہوئی ہوں گی، ایسا استقبال کسی صاحب اقتدار کو بھی نصیب نہیں ہوا ہوگا۔ ان کے اساتذہ فخر و ناز سے سرشار تھے۔ ساتھیوں کو ان سے شناسائی کا غرور تھا۔

اس کی غیر موجودگی میں اس کی کامیابیوں کے قصے گردش کرتے رہتے تھے۔ وہ طلبہ جنہوں نے صرف اس کے قصے سنے تھے' اسے دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ ریل کے انجن نے علی گڑھ پلیٹ فارم کے قدم چومے۔ محسن الملک کی ہمراہی میں چند اساتذہ اس

ڈبے کی طرف بڑھے جس میں وہ سفر کر رہا تھا پھر ایک روشن چہرہ باہر آیا۔ بلند ہونے والے نعروں سے پورا شہر گونج اٹھا۔ اچانک پھولوں کی برسات شروع ہوگئی۔ اب اسے نواب محسن الملک کے ساتھ ان کی کوٹھی کی طرف روانہ ہونا تھا۔ گھوڑوں کی بگھیاں اسٹیشن کے باہر تیار کھڑی تھیں۔ وہ طلبہ کے کندھوں پر سوار اسٹیشن سے باہر آیا۔ طلبہ نے گھوڑے کھول دیے اور ان بگھیوں کو خود کھینچ کر کوٹھی تک لے کر گئے۔ دوسرے دن سے دعوتوں اور پارٹیوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ایک دن اسے جیمس لاٹوش، لیفٹیننٹ گورنر کا خط موصول ہوا جس میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا، جیمس لاٹوش اسے اس کی تعلیمی کامیابی پر مبارکباد پیش کریں گے یا پھر اسے سرکاری ملازمت پیش کی جائے گی۔ وہ انہی مضامین پر غور کرتا ہوا جیمس لاٹوش سے ملنے کے لیے پہنچ گیا۔

”سنا ہے مصر میں آپ نے بہت اچھا وقت گزارا؟“ جیمس لاٹوش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میں تو جہاں ہوتا ہوں، اچھا ہی وقت گزارتا ہوں۔ ہر جگہ ایسے اساتذہ مجھے مل جاتے ہیں جن سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کو مل جاتا ہے۔“

”مصر والوں کو تو آپ بہت کچھ سکھا کر آئے ہیں؟“

”میں مصر کے علاوہ بھی بہت سی جگہوں پر رہا۔ آپ وہاں کے بارے میں بھی کچھ پوچھیے۔“

”وہاں کے بارے میں شاید وائسرائے صاحب پوچھیں۔ مجھ سے تو صرف یہ کہا گیا تھا کہ میں یہ معلوم کروں کہ جو رپورٹس ہمیں وہاں سے ملی تھیں، ان کے بارے میں خود آپ کیا کہتے ہیں؟“

”میں سرِدست یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ میں نے اپنے لیکچروں میں جو کچھ کہا اس کا تعلق تعلیمی حالت سے تھا جو میرا سبجیکٹ ہے۔“

"ٹھیک ہے، آپ جا سکتے ہیں۔"

لارڈ جیمس لاٹوش نے اشارہ دے دیا تھا کہ وائسرائے بھی اس سے ملنے کے خواہاں ہیں۔ یہ اشارہ بہت جلد عملی صورت اختیار کر گیا۔ لارڈ منٹو کے پرائیویٹ سیکریٹری ڈنلاپ اسمتھ نے وائسرائے سے ملاقات کے لیے اسے طلب کیا۔ وائسرائے نے بھی قیام مصر کے متعلق تمام حالات دریافت کیے البتہ انہوں نے زیادہ صفائی سے اپنا مقصد بیان کر دیا۔

"آپ ہندوستان سے باہر تھے لیکن آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ان چار پانچ برسوں میں حالات کتنے بدل چکے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ علی گڑھ کالج جسے آپ قومی ادارہ کہتے ہیں، سیاست کے نام پر بغاوت میں ملوث ہو۔ ہم اسے سیاسی ہوا سے بچانے کے لیے ہر سوراخ کو بند کر دینا چاہتے ہیں۔

مصر میں آپ کی سرگرمیاں ہرگز پسندیدہ نہیں تھیں۔ ہم نہیں چاہیں گے کہ اس غلطی کو آپ یہاں دہرائیں۔ آپ کو محتاط رہنا ہو گا۔"

اب ضیاء الدین کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ اس نے کسی بحث میں الجھنے کو مناسب نہ سمجھا وہاں وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ اپنے ملک میں آزادی رائے کا سبق پڑھاتے ہو لیکن جب ہم اس سبق کو یہاں آ کر دہراتے ہیں تو ہمارا گلا گھونٹنے کے درپے ہو جاتے ہو۔ ہر اس آدمی سے ڈرنے لگتے ہو جس کی ذہنی طاقت کا تمہیں یقین آ جاتا ہے۔

ان دونوں افراد سے ملاقات کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ وہ نواب محسن الملک کے علم میں تمام باتیں لے آئے۔ وہ فوراً نواب صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ محسن الملک نے علی گڑھ کی موجودہ پالیسی اسے سمجھائی اور صاف طور پر کہہ دیا کہ اس پالیسی پر عمل کیے بغیر یہاں ٹھہرنا ممکن نہیں۔ دوسری صورت میں افسوس کے ساتھ اسے علی گڑھ سے رخصت کرنا پڑے گا۔ ضیاء الدین اس شکست کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن بالآخر نواب صاحب کے دلائل نے اسے متاثر کر لیا۔ اسے تسلیم کرنا پڑا کہ موجودہ علی گڑھ کی ترقی

حکومت کی حمایت سے ہی ہو سکتی ہے۔ اگر مخالفت کا شائبہ بھی ہو گا تو ترقی تو در کنار کالج موجودہ حیثیت میں بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

اس زمانے میں تقسیم بنگال کا ایجی ٹیشن زور پر تھا۔ جا بجا دہشت اور انارکی کے مراکز قائم ہو رہے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں جو سیاسی بیداری ہو رہی تھی اور گزشتہ چھ سال میں اردو، ہندی کے قضیے نے جو صورت اختیار کر لی تھی وہ ہرگز ایسی نہیں تھی کہ انگریز حکومت اسے نظر انداز کر دیتی۔ اسے سیلاب سے پہلے بند باندھنے کی جلدی ہو رہی تھی۔ حکومت کو معلوم تھا کہ علی گڑھ، تعلیم یافتہ نوجوانوں کا مرکز ہے لہذا وہ خاص طور پر اس ادارے کو سیاست سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ کالج کے مفاد میں یہی تھا کہ اس کا اسٹاف سیاست سے دور رہے۔ کالج کے ٹرسٹیوں نے اپنی پالیسی میں یہ بات خاص طور پر شامل کی تھی۔ ضیاء الدین نے بھی مجبوراً اسی پالیسی کی اتباع میں عافیت سمجھی۔

اس عرصے میں کالج کے انتظامات میں جو اصلاحات کی گئی تھیں، ان کے مطابق ٹیوٹر اور اس کے اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ ضیاء الدین کو بھی اسسٹنٹ بنایا گیا۔ اس عہدے کے فرائض میں طلبہ کے ساتھ ذاتی تعلقات اور شخصی روابط کی بڑی اہمیت تھی۔ ضیاء الدین کے مزاج میں اپنے حسن سلوک سے طلبہ کا دل جیتنے کا کمال ہنر تھا، لہذا وہ اپنے فرائض دل جمعی سے ادا کرنے لگا۔ پروفیسر کی حیثیت سے تعلیم اور ٹیوٹر کی حیثیت سے چند ہاسٹلوں کے اقامتی انتظام سے اس کا تعلق تھا، لیکن اس کی تربیت درحقیقت قوم کے عام تعلیمی مقاصد کے لیے ہوئی تھی اور کالج کے انتظامی امور میں اس کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا اس لیے وہ ایک حد تک ان معاملات میں بھی دخیل تھا۔

ہندوستان پہنچتے ہی اس نے جدید جیومیٹری کو روشناس کرایا۔ اب تک ہندوستان میں جیومیٹری کے نام پر اقلیدس پڑھائی جاتی تھی۔ اس نے جدید جیومیٹری کی تعلیم اٹلی میں حاصل کی تھی۔ الہ آباد میں مسٹر ڈے لافوس، ڈائریکٹر تعلیمات کی خواہش پر اس نے لیکچر دینے منظور کیے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ مدعو کیے گئے اور اس نے ان اساتذہ کے سامنے چار

روز لیکچر دے کر اس علم کے مسائل ذہن نشین کرائے۔

اس نے اپنے قیام یورپ کے زمانے میں تعلیم و تعلم کے مسائل کا انہماک کے ساتھ مطالعہ کیا تھا جس میں ابتدائی تعلیم خاص موضوع تھا۔ وہ ان تجربات سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان میں بھی ابتدائی تعلیم کا قبلہ درست کرنا چاہتا تھا۔ یہ موقع اسے اس وقت مل گیا جب ڈھاکا میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔

اس نے اپنے بعض تجربات و خیالات کا اظہار کیا اور تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا کہ ابتدائی تعلیم کا آغاز مادری زبان میں ہو۔ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے آغاز اور اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تجویز نے تعلیمی طبقات کا خیال اس طرف رجوع کیا اور آئندہ زمانوں میں جو کچھ کامیابی ہوئی' اس کی یہی تجاویز سنگ بنیاد ہو گئیں۔

کالج میں ٹینس کلب قائم کیا۔ گیمز کلب کے ساتھ ساتھ ریڈنگ روم قائم کیا۔ ڈبنگ سوسائٹی قائم کی۔ نئے طلبہ کی جھجک مٹانے اور ان کو یونین کے مباحث اور تقریروں میں شریک ہونے کی تیاری کے لیے جونیئر ڈبیٹنگ سوسائٹی قائم کی گئی۔ کالج میں سوئمنگ پول بنوایا۔ پندرہ ہزار روپے سالانہ کی گرانٹ منظور کرائی اور تیراکی کا مقابلہ جاری کر کے اس کے انعامات مقرر کرائے۔

اسے یورپ سے آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ وہ علی گڑھ سے الہ آباد جا رہا تھا۔ اوپر کی برتھ ریزرو کرالی تھی۔ ناشتے دان سرہانے رکھ کر آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ کسی اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ وہ چہل قدمی کے لیے پلیٹ فارم پر آ گیا۔ ایک شخص جو اسی کے ڈبے میں نیچے کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا' ٹرین سے اترا اور اس کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگا۔ ایک آدھ مرتبہ اسے پہلے بھی احساس ہوا تھا کہ خفیہ پولیس اس کی نگرانی کرتی ہے۔ اس آدمی کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا۔ وہ مزید تصدیق کے لیے چائے کے اسٹال پر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد دیکھا کہ وہ آدمی بھی چائے کے اسٹال پر موجود ہے اور چائے پی رہا ہے۔

''آپ آرام سے چائے پئیں۔ پیسے میں نے ادا کر دیے ہیں'' ضیاء الدین نے اس آدمی سے کہا۔

''میری چائے کے پیسے آپ کیوں دیں گے۔ میں خود دوں گا۔'' اس آدمی نے کہا۔

''واہ صاحب! آپ کیسے دیں گے' آپ تو میری خدمت پر مامور ہیں۔''

''کیا بات کر رہے ہیں آپ!''

''آپ اتنی محنت سے میری نگرانی کریں اور میں آپ کو چائے بھی نہ پلواؤں' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''جب آپ سمجھ ہی چکے ہیں تو آپ سے کیا پردہ۔ کیا کریں صاحب' ڈیوٹی ہے۔''

''چائے پی کر ڈبے میں آجاؤ۔ کھانا میرے ساتھ کھانا۔'' ضیاء الدین نے کہا اور اسے چائے کے اسٹال پر چھوڑ کر اپنے ڈبے میں آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ایک ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

''صاحب' آپ اتنے اچھے آدمی ہیں پھر آپ کی نگرانی کیوں کرائی جا رہی ہے؟'' اس آدمی نے پوچھا۔

''یہ تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔''

''مجھ سے تو یہ کہا گیا ہے کہ آپ ایک خطرناک آدمی ہیں۔ راستے میں آپ سے کون کون ملتا ہے۔ آپ کیا باتیں کرتے ہیں' میں نوٹ کرتا ہوں۔''

''تم اپنا کام کرتے رہو' پچھلے اسٹیشن پر جو لڑکے مجھ سے ملنے آئے تھے وہ میرے شاگرد تھے۔ اگلے اسٹیشن پر بھی کچھ ایسے ہی طلبہ مجھ سے ملنے آئیں گے۔''

''آپ ان طلبہ سے کیا کام لے رہے ہیں جو آپ کی نگرانی کرائی جا رہی ہے؟''

''حکومت کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ میرے عزائم سیاسی ہیں حالانکہ اس وقت بھی

میں تعلیمی موضوعات پر لیکچر دینے الٰہ آباد جا رہا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے صاحب۔ میں اپنی رپورٹ میں لکھ دوں گا کہ یہ شخص قطعی سیاسی آدمی نہیں ہے۔‘‘

’’میرے کہنے سے مت لکھنا۔ ہو سکتا ہے میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ جو تم نے دیکھا ہے یا دیکھو گے‘ وہ لکھنا۔‘‘

’’مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ جس شخص کی نگرانی کے لیے مجھے بھیجا جا رہا ہے‘ وہ اتنا بڑا پروفیسر ہے۔‘‘

’’چلو‘ اب تو معلوم ہو گیا۔‘‘

وہ مختلف اسٹیشنوں پر احباب سے ملتا ہوا الٰہ آباد پہنچ گیا۔ الٰہ آباد پہنچتے ہی اس کی نگرانی پر مامور آدمی غائب ہو گیا۔ اس کی نگرانی مستقل ہو رہی تھی اور یہ نتیجہ تھا مصر میں اس کے باغیانہ لیکچروں کا۔ اب وہ ان خفیہ والوں کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ نہ صرف دیکھتے ہی پہچان لیتا تھا بلکہ مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھتا تھا۔ ان میں سے اکثر سے اس کی دوستی ہو جاتی تھی۔

وہ اس رات ایک عشائیے میں مدعو تھا۔ دعوت کے بعد بے تکلف دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے خاصی رات بیت گئی۔ رات گئے وہ گھر لوٹا تو کسی کام سے اپنے بنگلے کے اس کمرے میں گیا جس کو اس نے اپنے دفتر کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس کی خاص الماری کا پٹ کھلا ہوا تھا جبکہ وہ اتنا بد سلیقہ نہیں تھا کہ الماری کو کھلا چھوڑ کر چلا جاتا۔ کچھ سامان اور بھی بکھرا ہوا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کوئی آیا ہے۔ اس نے گھبرا کر اپنے سامان کی جانچ کی کہ کوئی چیز غائب تو نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر ایک دھچکا سا دل کو لگا کہ یورپ اور مصر کی تعلیم سے متعلق جتنا لٹریچر اور پراسپیکٹس وغیرہ تھے‘ وہ سب چوری ہو گئے تھے۔ اس کے سوا کوئی چیز غائب نہیں ہوئی تھی۔ کئی قیمتی اشیا کمرے میں تھیں جو اب بھی وہیں تھیں۔ اگر کوئی چور آیا ہوتا تو اور چیزیں بھی غائب ہوتیں۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ

یہ چوری نہیں ہے۔ یہ سامان حکومت نے غائب کرایا ہے۔ یہ ایسی چوری تھی جس کی رپورٹ بھی درج نہیں کرائی جاسکتی تھی۔

اس کی پہلی بیوی کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب وہ یورپ میں تھا۔ یورپ سے واپسی کے بعد اس نے دوسری شادی کی جس سے دو اولادیں ہوئیں۔ (ایک لڑکا' ایک لڑکی) اس بیوی نے بھی چند سال بعد رحلت کی پھر تیسری شادی کی۔ اس سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں مگر اس بیوی کی عمر نے بھی وفا نہ کی۔ اس کے بعد اس کی مصروفیات اس بات کی متقاضی تھیں کہ وہ شادی نہ کرے۔ بڑی لڑکی کی پرورش' اس کی نانی نے کی۔ لڑکا کبھی نانی کے پاس کبھی ضیاء الدین کے پاس رہا۔ ایک لڑکی کو اس کے چھوٹے بھائی علاؤالدین (ڈپٹی کلکٹر) نے اور ایک کو بہن نے پالا۔

☆☆☆

بین الاقوامی سیاست کے اس اتار چڑھاؤ سے ہندوستانی اذہان بھی متاثر ہو رہے تھے۔ سیاسی شعور کی بیداری' ذہنوں کے دروازوں پر دستک دینے لگی تھی۔ محتاط رویوں کے قائل بھی غصے میں بھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ ہر چند کہ انڈین نیشنل کانگریس پر ابھی تک لبرل خیالات غالب رہے تھے لیکن بنگال کی شورش پسندی' تقسیم بنگال اور پھر تنسیخ بنگال نے انگریزوں کے خلاف شدید غصے کی لہر دوڑا دی تھی۔ تنسیخ بنگال سے مسلمان برہم تو تھے ہی' ہندوستان سے باہر مثلاً ترکی میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا تھا' اس نے انہیں اور بھی برہم کر دیا تھا۔ گویا اب وہ دور آگیا تھا کہ ہندو' مسلمان دونوں انگریزوں سے ناخوش ہو گئے تھے۔ یورپ کی مسیحی سلطنتیں ایشیا کے لباس کو تار تار کر کے بیشتر افریشیائی ممالک پر قبضہ جما چکی تھیں اور اب ترکی ان کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

ترکی کو اسلامی سلطنت کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں مسلمانوں کے من پسند نظام خلافت کی جھلک موجود تھی۔ ہر چند کہ ترکی ہندوستان کی حدود میں نہیں تھا لیکن مسلمانوں کا مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکی کے

مسلمانوں سے خاص لگاؤ تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا اور ۱۹۱۲ء میں بلقانی ریاستوں نے روس کی شہ پا کر ترکی پر حملہ کر دیا۔ مغربی طاقتوں کی سازش کے نتیجے میں ترکوں کے ہاتھ سے بہت بڑا حصہ نکل گیا۔ اس حرب و پیکار نے ہندوستانی مسلمانوں میں ہیجان و کہرام برپا کر دیا۔

علی گڑھ کالج، عالم اسلام سے الگ نہیں تھا۔ یہاں کے طلبہ بھی ان بھرے ہوئے جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان طلبہ نے شہیدان جنگ طرابلس کی بیواؤں اور یتیموں کی امداد کے لیے فوراً ہی ایک فنڈ جاری کیا۔ کالج کی مسجد، طلبہ کے جلسوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ ان جلسوں میں انگریزوں کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی جاتی۔ جنگ کے شعلے بلقان تک پہنچے تو ہمدردی کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی۔

کالج کے اسٹریچی ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں یہ ریزولوشن بھی پاس ہوا کہ اس امدادی فنڈ کے لیے بعض خاص قسم کے کھانوں کو ترک کیا جائے اور جو بچت ہو، امدادی فنڈ کی مد میں جمع کی جائے۔ اس انتظام کے لیے ایک کمیٹی قائم ہوئی اور ڈاکٹر ضیاء الدین اس کے صدر مقرر ہوئے۔ طلبہ کا جوش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ناشتا ترک کر دیا۔ ایک وقت کا کھانا چھوڑ دیا۔ اپنی قیمتی اشیا فروخت کر کے رقم امدادی فنڈ میں جمع کر دی۔ کالج کے باہر، محمد علی جوہر جو اب تک ایک صحافی تھے، اس طرح گرج گرج اٹھے جیسے کوئی زخمی شیر۔ انھوں نے انگریزوں کو اس طرح للکارنا شروع کیا جیسے کوئی گھر کے بے ڈھنگے ملازم کو ڈانٹتا ہے۔ محمد علی جوہر اسی کالج کے پرانے طالب علم تھے اس لیے کالج میں ہونے والی سرگرمیوں کو حکومتی حلقوں میں شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری ایک طبی وفد لے کر ترکی جانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے رقم کا انتظام کرتے ہوئے وہ علی گڑھ بھی آئے۔ اسٹریچی ہال میں پھر ایک جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں ڈاکٹر انصاری نے اپنے مشن کے مقاصد بیان کیے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے ڈاکٹر انصاری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بہ حیثیت پریذیڈنٹ امدادی فنڈ پر ریزولوشن پاس کیا کہ

یہ کمیٹی جس قدر روپیہ فراہم کرے وہ اس مشن کی طبی امداد میں خرچ کیا جائے۔ اسی مہینے پہلی قسط کے طور پر چھ ہزار روپے دیے گئے۔ اس کے علاوہ چھ سینئر طلبہ بھی انصاری مشن میں شامل ہو گئے۔

سرسید مرحوم کی پالیسی یہ تھی کہ کالج کے طلبہ سیاست میں حصہ نہ لیں لیکن اب حالات بہت بدل گئے تھے پھر یہ کہ یہ طلبہ سیاست کے طور پر اس فنڈ میں حصہ نہیں لے رہے تھے، یہ ان کا مذہبی و ملی معاملہ تھا لیکن حکومت کو یہ بھی برداشت نہیں تھا۔ کالج کا پرنسپل ایک انگریز (مسٹر ٹول) تھا۔ اسے اور کالج کے دوسرے یورپین اسٹاف کو طلبہ کا یہ جوش و خروش پسند نہ تھا۔ ضیاء الدین سینئر ٹیوٹر تھا جس کے اختیار میں طلبہ کی بورڈنگ لائف تھی۔

''مسٹر ضیاء! آپ اپنے طلبہ کو لگام دیجیے'' ایک روز انگریز پرنسپل نے کہا۔

''سر! میں نے انہیں کبھی بے لگام نہیں کیا۔''

''وہ جب چاہتے ہیں جلسہ کر لیتے ہیں۔ فنڈ جمع کر کے ترکی بھیجتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں، آپ بھی حکومت کے خلاف ان سرگرمیوں میں شامل ہیں۔''

''سر! یہ لڑکے حکومت کے خلاف نہیں ہیں۔ اپنے مسلمان بھائیوں کی امداد کے لیے بے قرار ہیں۔''

''ترکی تمہارے ہندوستان کا حصہ نہیں ہے۔''

''مسلمان کہیں بھی ہو ہمارا بھائی ہے۔''

''یہ کیسی منطق ہے؟''

''یہ ایسی ہی منطق ہے۔''

''حکومت، ان طلبہ کی سرگرمیوں پر فکر مند ہے۔ مجھ سے پوچھا جاتا ہے، آپ انہیں روکیے۔''

''میں کوشش کروں گا۔''

ضیاء الدین نے محض ٹالنے کی کوشش کی تھی ورنہ وہ طلبہ کی ان سرگرمیوں کے

خلاف نہیں تھا۔ کالج کے سیکریٹری نواب وقار الملک تھے۔ وہ بھی پرنسپل کی بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ پرنسپل نے ضیاء الدین سے بات کر کے بھی دیکھ لی تھی۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کی طرف سے طلبہ کے خلاف نہایت وحشت انگیز، غلط اور مخالفانہ خیالات کی اشاعت کی گئی اور یہ تاثر دیا گیا کہ اگر یہی حالت رہی تو یہ طلبہ کالج سے باہر نکل کر تشدد کا راستہ اپنا لیں گے۔ اس پروپیگنڈے کی حقیقت جاننے اور کالج اسٹاف کو متنبہ کرنے کے لیے گورنر، سر جیمس مسٹن علی گڑھ کالج پہنچا۔ اپنی تقریر میں اس نے طلبہ کو سیاسی افکار و مصروفیات سے باز رکھنے کی تلقین کی۔ یہ ایک قسم کی دھمکی تھی جو اس نے دی اور چلا گیا۔ اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ضیاء الدین سمیت تمام اسٹاف کو کالج کی سلامتی کی فکر تھی۔

نواب وقار الملک عوارض جسماتی کی وجہ سے مستعفی ہو گئے۔ نواب اسحٰق خان نے سیکرٹری شپ کا چارج لیا اور اپنی پہلی ہی تقریر میں حکومت کے ساتھ اظہار عقیدت کیا۔ کالج کے ڈسپلن پر خاص طور پر زور دیا جو ان کے خیال میں بہت خراب ہو گیا تھا۔ ان کے ان خیالات کی وجہ سے کالج ہی میں ایک مخالف طبقہ بھی پیدا ہو گیا۔ اسی مہینے کالج کے ٹرسٹیوں نے ایک ریزولوشن بھی پاس کیا کہ طلبہ کو دوران تعلیم سیاست میں حصہ لینے کی ممانعت کی جائے۔

ضیاء الدین نے اپنی حکمت عملی سے ڈسپلن کا بے نظیر نمونہ پیش کیا، لیکن یورپین افسروں کے حلقے میں یہ خیال قائم ہو چکا تھا کہ مسلمانوں میں جو تمام شورش پھیل رہی ہے، اس میں علی گڑھ کالج کے اولڈ بوائز ہی پیش پیش ہیں۔ کالج اب ان کی نظروں میں کھٹکنے لگا تھا۔ حکام اب برملا کہا کرتے تھے کہ مسلمان نوجوانوں کی جماعت انگریزی اقتدار کی سخت مخالف ہے۔

یہ علی گڑھ کالج کے لیے نہایت نازک دور تھا۔ کالج کے بہی خواہ اس کی سلامتی کی فکر میں تھے کیونکہ اس کالج کے مٹتے ہی مسلمانوں کی تعلیمی حالت تباہ ہو جاتی۔ کوئی دوسرا ادارہ ایسا نہیں تھا جہاں تعلیم یافتہ سپاہی تیار ہو سکتے تھے۔ بہی خواہان کالج کو طلبہ کے جذبات

کا خیال بھی رکھنا تھا اور کالج کو بھی بچانا تھا۔ اگر وہ طلبہ کو مکمل چھوٹ دیتے تھے تو حکومت کا عتاب تیار کھڑا تھا اور طلبہ پر پابندی لگاتے تھے تو قومی جذبے کا خون ہوتا تھا اور انتظامیہ انگریز کے پٹھو کہلاتی تھی۔ یہ مشکل اور اس لیے بڑھ گئی تھی کہ اسٹاف میں انگریز بھی تھے۔ خود پرنسپل انگریز تھا۔ اس وقت بس ایک ہی راستہ تھا کہ ہر معاملے کو اعتدال میں رکھا جائے لیکن حالات اعتدال کے رستے سے مستقل ہٹتے جارہے تھے۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کا جرمنی اور اٹلی میں آغاز ہوا۔ جب برطانوی سلطنت بھی جرمنی کے خلاف شریک جنگ ہوگئی تو اس سلسے میں کالج کے پانچ سو طلبہ کی خدمات ہندوستان میں یا ہندوستان سے باہر رضا کارانہ مدافعت اور ایمبولینس کے کاموں کے لیے پیش کی گئیں۔ طلبہ نے چندے میں معقول رقم بھی پیش کی۔ اعتدال اور مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔ ابھی تک سب ٹھیک تھا لیکن جب ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا اور برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کردیا تو مسلمانوں کی تمام ترہمدردیاں ترکی کے ساتھ ہوگئیں۔ تاج برطانیہ کے سائے میں رہنے والے ہندوستانی مسلمانوں کی یہ گستاخی برطانوی حکمرانوں کو کیسے برداشت ہوسکتی تھی؟ لیکن مسلمانوں کے نزدیک یہ مسئلہ صرف سیاسی نہیں تھا مذہبی بھی تھا۔ چنانچہ محمد علی جوہر نے حکومت ہند سے یہ مطالبہ کردیا کہ ہندوستانی افواج میں چونکہ مسلمان بھی شامل ہیں اس لیے انہیں لڑنے کے لئے باہر نہ بھیجا جائے کیونکہ خطرہ ہے کہ انہیں ترکوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا اور ہمارے مذہب میں مسلمانوں سے لڑنا جائز نہیں۔

اس پرزور مطالبے کا اثر یہ ہوا کہ حکومت نے یہ وعدہ کیا کہ ترکی کی خلافت اور مقامات مقدسہ پر ضرب نہیں پڑنے دیں گے۔ اس وعدے کے الفاظ ابھی پرانے بھی نہیں ہوئے تھے کہ اتحادیوں نے اپنی فوجوں کو بصرہ اور جدہ میں داخل کردیا۔ حکومت کی اس عیاری اور وعدہ خلافی نے مسلمانوں کو مشتعل کردیا۔ محمد علی جوہر نے چالیس گھنٹے کی مسلسل مشقت کے بعد مشہور زمانہ مضمون Choice of the Tracks لکھا۔ یہ مضمون کامریڈ

میں شائع ہوا۔ مضمون کا چھپنا تھا کہ برطانوی سیاست کے خیموں میں جیسے آگ لگ گئی۔ اس مضمون کے صلے میں ان کے دونوں پرچوں (کامریڈ اور ہمدرد) کی ضمانت ضبط ہو گئی، اس سے بھی تشفی نہیں ہوئی تو پہلے انہیں نظر بند کر دیا گیا پھر چھندواڑہ سے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

علی برادران اب اتنے غیر اہم نہیں رہے تھے کہ وہ گرفتار ہوں اور ملک میں سناٹا پھیلا رہے۔ ان کی رہائی کے لیے کونے کونے سے آوازیں آنے لگیں۔ ہندوستان میں آگ لگی ہوئی تھی لیکن انتظامیہ کی دانش مندی کی وجہ سے کالج میں مکمل امن و سکون تھا۔ لارڈ ہارڈنگ کے الفاظ میں

''اس پانچ سال میں ایسے مواقع آئے جو پیچیدگی اور تشویش کے تھے مگر وہ گزر گئے۔ کالج بدستور اپنی روایات پر استحکام کے ساتھ قائم رہا اور جوش کے عارضی جھونکوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔''

حکومت نے سڈلر کمیشن کے نام سے ایک کمیشن بنایا تھا جس کا مقصد تعلیمی پستی کے اسباب معلوم کرنا تھا۔ ضیاء الدین واحد مسلمان تھے جنہیں اس کمیشن میں شامل کیا گیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں کالج کی فضا کو پرسکون حالت میں چھوڑ کر وہ کمیشن کے تحقیقاتی دوروں اور کاموں کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی غیر موجودگی میں کالج کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔

علی گڑھ میں موجود اولڈ بوائز کو کالج کے کاموں میں قدرتی طور پر دخیل ہونے کا پورا موقع تھا اور ان کی ایک مختصر جماعت بن گئی تھی۔ باہر کے جوشیلے اولڈ بوائز مثلاً مولانا شوکت علی وغیرہ کی ایک جماعت۔ ان دونوں کے اختلافات نے کالج کی فضا کو مکدر کر دیا۔ طلبہ اور اسٹاف پر پابندی تھی کہ وہ سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے تھے لیکن باہر سیاسی آندھی اس زور کی چل رہی تھی کہ کالج کا اس سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ سیاست کا پودا یہاں بھی لہلہانے لگا۔

جنگ ختم ہوچکی تھی اور حکومت نے ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے رولٹ ایکٹ جیسے جابرانہ قوانین کا تحفہ ہندوستانیوں کو عطا کیا۔ مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے۔ انگریزوں نے عراق اور جزیرۃ العرب کے مقامات مقدسہ پر گولہ باری کی۔ مکہ اور مدینہ بھی توپ کے گولوں کی زد میں تھے۔ ترکی کے ٹکڑے کر دیے۔ کون مسلمان ہوسکتا تھا جو ان خبروں سے تڑپ نہ اٹھتا۔ انجمن خدام کعبہ تشکیل دی گئی۔ خلافت کی بقا کے لیے خلافت کمیٹی بنی۔ گاندھی جی نے ۱۹۱۹ء میں ستیہ گرہ کی بنیاد ڈالی۔ جلسے ہونے لگے، جلوس نکالے گئے۔ کالج کے اندرونی اختلافات نے کمر توڑ دی تھی، باہر کے حالات بھی اندر پہنچنے لگے۔

ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم، حکومت کی تعلیمی مشنری کا زبردست پرزہ تھا۔ اسے حالات سے نہیں، یورپین اقتدار سے غرض تھی۔ اس موقع پر بھی اس نے کالج دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی چنانچہ یونیورسٹی انسپکٹر نے کالج کا معائنہ کیا اور ایک مفصل رپورٹ مرتب کی۔ تعلیم، ڈسپلن، کیریکٹر، غرض کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس پر شدید حملہ نہ ہوا ہو۔ کوئی ایسی برائی نہیں تھی جو ہر شعبے میں موجود نہ ہو۔ طلبہ کے سیاسی رجحانات پر بھی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں یونیورسٹی سے الحاق ختم کردینے کی بھی سفارش کی گئی تھی۔ کالج کو مزید مشکلات کی طرف دھکیلنے کے لیے پہلے پرنسپل مسٹر ٹول نے استعفیٰ دیا، پھر تمام یورپین اسٹاف یکے بعد دیگرے مستعفی ہوگیا۔

اب بڑی مشکل پرنسپل اور اسٹاف کی خالی جگہوں کا پر کرنا تھا۔ اس پیچیدہ صورت حال پر قابو پانے کے لیے کسی مناسب آدمی کی ضرورت تھی بالآخر سب کی نظر ڈاکٹر ضیاء الدین کی طرف اٹھی۔ یورپین اسٹاف کا چلا جانا، یونیورسٹی انسپکٹروں کی رپورٹ، تنسیخ الحاق کی دھمکی، حکومت صوبہ کی نظر عتاب، اولڈ بوائز کی معرکہ آرائیاں، ان سب نے مل کر ہیبت ناک طوفان کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اس حالت میں ڈاکٹر ضیاء الدین کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔

ضیاء الدین اپنی منزل سے بہت دور چلا گیا تھا۔ وہ بہت بڑا ریاضی دان تھا۔ ایک کالج کی پرنسپل شپ اس کی معراج نہیں تھی بلکہ یہ اس کا راستہ ہی نہیں تھا۔ وہ اگر کسی پرسکون ملک میں ہوتا تو اپنی تحقیقات سے ریاضی کی دنیا میں دھوم مچا دیتا۔ کیسی کیسی علمی ترقیاں اس کے دم سے ہوتیں لیکن وہ ایک محکوم قوم کا فرزند تھا۔ اسے اپنی تعلیم سے زیادہ دوسروں کی تعلیم کی فکر کرنی پڑ رہی تھی۔ وہ اپنے موضوع پر کوئی مستقل تصنیف تک نہیں لکھ سکا تھا۔ اسے علی گڑھ سے بڑی امیدیں تھیں۔ وہ اپنی امیدوں کو پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے اپنی قوم کے لیے اتنا کام کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ اپنی منزل بھول گیا تھا۔

اس رات بھی وہ بہت دیر تک اپنے انتخاب پر غور کرتا رہا۔ ''پرنسپل شپ کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد کیا میری علمی کارکردگی پر اثر نہیں پڑے گا؟ میں ان انتظامی بکھیڑوں سے الگ رہ کر کس قدر علمی کام کر سکتا ہوں؟ کیا یہ میرا نقصان نہیں ہے؟''

اس نے خود سے سوال کیا۔ میں نے اگر کتابیں لکھ بھی لیں اور انہیں پڑھنے والا کوئی نہ ہوا تو پھر میرے لکھنے کا کیا فائدہ! یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں ایک ایسے ملک میں پیدا ہوا ہوں جہاں کتابیں لکھنے والوں سے زیادہ کتابیں پڑھنے والوں کی ضرورت ہے۔ اس وقت اگر میں نے اپنی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا تو اس ادارے کا نہ جانے کیا حال ہو جو سرسید نے بڑے ارمانوں سے قائم کیا تھا۔ یہ خیال اسے ہمیشہ بے چین کر دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ بے قرار ہو گیا۔ ہزار کتابیں لکھنے سے بہتر یہ عمل ہے کہ اس ادارے کو بچایا جائے۔ وہ بہت کچھ سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اس وقت حکومت وقت سے ٹکرانے سے ایسا نقصان ہو سکتا ہے جس کا ازالہ عرصے تک نہیں ہو سکے گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ انگریز نواز پالیسی پر اس کی زبردست مخالفت ہوگی۔ اس کا کردار مسخ کر کے پیش کیا جائے گا لیکن اسے ادارے کی بہبود کے لیے اپنی کردار کشی منظور تھی۔

امتحانات ہو چکے تھے۔ کالج بند تھا۔ اس نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور مختلف مقامات کے دورے کر کے غلط فہمیاں اور بدگمانیاں دور کیں۔ کالج کے پیٹرن

ہز آنز سر ہار کورٹ ٹیلر سے ملاقات کر کے اپنے عزائم کا اظہار کیا اور انہیں کالج میں مدعو کیا۔ ٹرسٹیوں اور اولڈ بوائز کو بھی دعوت دی۔ اس نے اپنی شخصیت کا جادو کچھ اس طور سے چلایا کہ اس پر آشوب دور میں بھی ایک انگریز حاکم کا طلبہ نے نہایت شاندار استقبال کیا۔ پوری عمارت کو آراستہ کیا گیا تھا۔ کلاس کے کمروں کی تزئین دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جب وہ تقریر کرنے ڈائس پر آئے تو چھت کے روشن دان سے اس وقت تک پھولوں کی بارش ہوتی رہی جب تک انہوں نے تقریر ختم نہیں کر لی۔ اس آرائش وزیبائی کا تذکرہ انہوں نے خاص طور پر اپنی تقریر میں کیا۔

"میں اس تکلیف کی تہ دل سے قدر کرتا ہوں جو آپ نے اپنے کلاس کے کمروں اور مختلف عمارتوں کو مجھے عزت دینے کے لیے آراستہ کرنے میں اٹھائی۔"

ہز آنز کی تقریر جس قدر الفاظ میں ہمدردانہ تھی اس سے زیادہ عملی ثابت ہوئی اور وہ نتائج ظہور پذیر ہوئے جن کی گزشتہ چند سال کے واقعات پر نظر کرتے ہوئے دور کی امید بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ سر ہار کورٹ ٹیلر کے دورے کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ کے بجٹ سے جو گرانٹ منظور ہوئی تھی اور رکی ہوئی تھی، وہ معقول اضافے کے ساتھ ملی۔ پبلک میں یہ احساس پیدا ہوا کہ گورنمنٹ کی نظر التفات اس کالج پر پھر ہونے لگی ہے لہذا داخلے بڑھنے لگے۔ یہ سب ضیاء الدین احمد کی ذاتی کوششوں اور دور اندیشی کی وجہ سے ہوا۔

☆☆☆

"یہ وائسرائے صاحب ہمیشہ سے وائسرائے نہیں تھے۔ ہم نے تسلیم کیا تو وہ وائسرائے ہوئے۔ فرعون جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تو خدا نہ تھا۔ لوگوں نے تسلیم کیا تو وہ خدا ہوا۔ یاد رکھئے کسی کی حکومت بھی دائمی نہیں۔ دائمی حکومت ہے تو صرف خدا کی۔"

محمد علی جوہر کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ مظالم پنجاب کا زخم ہرا تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے عالم اسلام پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ترکی کی عظیم الشان سلطنت پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ محمد علی جوہر آزادی کی آخری کوشش کے طور پر ایک وفد لے کر ممالک غیر گئے تھے تاکہ

آزادی کا مقدمہ پیش کر سکیں اور اب بے نیل مرام واپس آ چکے تھے۔اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہندو، مسلمان مل کر اپنی آزادی چھین لیں۔ کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے مشترکہ اجلاس ہوئے۔محمد علی جوہر نے گاندھی کے ساتھ مل کر عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی۔

''میں ہندوؤں سے بھی یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ خود مختاری اور آزادی کے خواہاں ہیں تو عدم تعاون میں مسلم ہمسایوں کے ساتھ شریک ہو جائیں۔''

کانگریس کے لیے یہ ایک سیاسی مسئلہ تھا لیکن مسلمانوں کے لیے مذہبی سوال بن گیا۔خطابات واپس کیے جانے لگے اور سرکاری ملازمتوں سے استعفے دیے جانے لگے۔ملک کی اس فضا کو دیکھتے ہوئے ضیاءالدین کو یہ فکر ہوئی کہ کہیں عدم تعاون کی زد میں علی گڑھ کالج بھی نہ آ جائے، انہوں نے سیلاب سے پہلے بند باندھتے ہوئے مولانا شوکت علی سے ملاقات کی۔

''میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ترک موالات کے ساتھ ساتھ ترک تعلیم کا نعرہ بھی بلند ہونے والا ہے'' ضیاءالدین نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

''ہر اس چیز کا بائیکاٹ ہو گا جس سے انگریزوں کے پاؤں اکھڑ سکتے ہوں'' مولانا شوکت علی نے جواب دیا۔

''تعلیم تو مسلمان یا انگریز نہیں ہوتی۔''

''علی گڑھ کالج گورنمنٹ کی گرانٹ سے چلتا ہے اور گورنمنٹ کی پالیسیوں کو تحفظ دیتا ہے۔مسلمان لڑکوں کو گورنر پر پھول برسانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔''

''آپ تو خود اس کالج کے ٹرسٹی رہ چکے ہیں۔''

''میں اس وقت بھی انگریزوں کے عمل دخل کے خلاف تھا......اور اب تو حالات بالکل ہی بدل چکے ہیں۔''

''جناب، خلافت کا کام کرنے والوں میں بیشتر علی گڑھ کے طلبہ ہیں اور علی گڑ

ہی ان کی فیکٹری ہے' اگر اس کو ختم کیا گیا تو کام کرنے والے کہاں سے ملیں گے۔''

اس دلیل کے آگے مولانا نے سپر ڈال دی اور دونوں کے سامنے یہ سمجھوتا ہو گیا کہ کالج کو محفوظ رکھا جائے گا۔ یہ سمجھوتا اگست ۱۹۲۰ء میں ہوا لیکن اکتوبر میں اسی کالج کے نامور اولڈ بوائز کی طرف سے ایک بیان پریس میں شائع ہوا جس میں گورنمنٹ گرانٹ اور گورنمنٹ اسکالر شپ ٹھکرا دینے پر زور دیا گیا تھا پھر معلوم ہوا مسٹر گاندھی اور علی برادران کالج پر حملہ آور ہونے اور طلبہ سے براہ راست مخاطب ہونے کے لیے علی گڑھ پہنچنے والے ہیں۔ اس نے مسٹر گاندھی سے ملاقات کی۔

''کیا یہ مناسب طریقہ ہو گا کہ آپ ٹرسٹیز' اسٹاف اور پرنسپل کی اجازت کے بغیر طلبہ سے خطاب کریں؟'' اس نے گاندھی سے پوچھا۔

''میں تعلیمی نقطہ نظر سے اپنے رویے کی تائید نہیں کروں گا لیکن اعلیٰ سیاسی اسباب کی بنا پر میں ان تعلیمی اصولوں کو بالائے طاق رکھنے کے حق میں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ٹرسٹیز کبھی اس کے حق میں نہیں ہوں گے کہ گرانٹ بند ہو جائے یا اسٹاف اعلیٰ تنخواہوں والی جگہیں چھوڑ دیں۔''

''پھر طلبہ سے آپ کیا اپیل کرنا چاہتے ہیں؟''

''یہی کہ سیاسی پروپیگنڈے میں وہ ہمارے معاون ہوں'' انہوں نے کچھ دیر کے توقف کے بعد کہا ''ہم کالج کی عمارت اپنی قومی آرگنائزیشن کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔''

''پھر طلبہ کی تعلیم کا کیا ہو گا؟''

''ہم اپنا نیشنل کالج بنائیں گے۔''

''یہ آپ کسی جگہ بھی بنا سکتے ہیں۔ احمد آباد ہر لحاظ سے موزوں مرکز ہو سکتا ہے۔''

''ہم ایک اسکول کی بنیاد احمد آباد میں ڈال چکے ہیں۔''

اس جواب کے بعد کسی اور سوال کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ضیاء الدین احمد دوسرے

دن کا انتظار کرنے لگا کیونکہ علی برادران کو اگلے دن کالج پر حملہ آور ہونا تھا۔ کیا حالات پیش آتے ہیں؟ ان حالات کی روشنی ہی میں اسے کوئی قدم اٹھانا تھا۔

علی برادران کے لیے نہ علی گڑھ نیا تھا نہ علی گڑھ کالج کے درو دیوار نئے تھے۔ یہ اس کالج کے ٹرسٹیز بھی تھے۔ لڑکپن اور جوانی کے دن یہاں گزارے تھے۔ کرکٹ کا میدان ابھی تک دونوں کی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی طالب علموں نے انہیں گھیر لیا۔

"کعبۃ اللہ کی حفاظت ہمارا سب سے بڑا فرض ہے۔ اس کو بچانے کے لیے ہمیں اپنی جانیں قربان کرنا ہیں۔ جب اس پر حملے کی تیاریاں ہو رہی ہیں تو ہم سب مسلمان یہاں سے ہجرت کر کے، گرتے پڑتے اس کی حفاظت کو پہنچیں گے۔ اپنے گھروں کو ویران کریں گے تاکہ اللہ کا گھر محفوظ رہے۔ اس کی مسجدوں میں قفل پڑ جائیں، وہ بڑی مسجد آباد رہے۔"

طلبہ کے لیے ان کی شعلہ بیانی نئی نہیں تھی لیکن آج ان کا محبوب لیڈر محض ان سے ملنے آیا تھا۔ وہ ان سے مدد مانگ رہا تھا۔ ان کے خیال میں کالج پر انگریزوں اور انگریز کا قبضہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ طلبہ اس کے خلاف بغاوت کر دیں۔ طلبہ کے کلب میں ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت ایک طالب علم نے کی۔ اگلے روز طلبہ کلاسوں میں نہیں آئے تھے اور اسٹوڈنٹ کلب کے باہر جمع ہو گئے۔ مولانا شوکت علی اور محمد علی جوہر نے طلبہ سے خطاب کیا اور طالب علموں نے یہ ریزولوشن پاس کیا۔

"اگر ٹرسٹیز کی جماعت نے ۲۹ / اکتوبر تک کالج کی امداد کو نامنظور نہ کیا اور کالج کا الحاق ختم نہ کر دیا تو طالب علموں پر لازم ہو گا کہ ان تمام ذرائع کو جو ان کے اختیار میں ہیں استعمال کریں۔ یہ کالج سینٹرل خلافت کمیٹی کے ماتحت ایک ادارہ بن جائے اور تمام نوجوان خلافت کے کام میں مصروف ہو جائیں۔"

اس کے بعد ضیاء الدین کا گھبرانا قطعی تھا۔ وہ اب برملا کہہ رہا تھا کہ مسٹر گاندھی اس وقت ایک تیر سے دو شکار کھیل رہے ہیں۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کے ایک اہم قومی

تعلیمی مرکز کو تباہ کرنے کے درپے ہیں' دوسری طرف وہ یہ کام مسلمانوں کے ہاتھوں کرانا چاہتے ہیں۔ضیاء الدین سخت مشکل میں تھے۔ان کا مقابلہ غیروں سے نہیں اپنوں سے تھا اور اپنے بھی کیسے! محمد علی جوہر جیسا شعلہ بیان مقرر اور بااثر لیڈر۔کوئی اور ہوتا تو ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔

اس وقت ایک ایسی حکمت عملی کی ضرورت تھی کہ ہنگامہ ہو نہ اسٹرائیک۔طلبہ کا نقصان بھی نہ ہو اور ادارہ بھی بچ جائے۔اس نے جس ادارے کی معمولی سی تنخواہ کے لیے ڈپٹی کلکٹری چھوڑ دی تھی' اب اس کا امتحان تھا کہ وہ اس ادارے کو جذبات کی تیز آندھی سے بچائے۔اس نے ایک گشتی خط تمام والدین کو بھیجا اور ان خطرات سے آگاہ کیا جو ایسی صورت میں پیدا ہوں گے۔مقصد یہ تھا کہ والدین اپنے بچوں کو سمجھائیں اور بعد میں کسی نقصان کے وہ خود ذمہ دار ہوں۔اس خط کے جواب میں بہت سے والدین علی گڑھ آئے اور ان میں سے بہت سے لوگ اپنے بچوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔کچھ لڑکے اپنی مرضی سے علی گڑھ چھوڑ کر چلے گئے۔کالج میں باقاعدہ کلاسیں ہو رہی تھیں لیکن خطرے کا بگل بجنے کو تھا۔۲۹/اکتوبر قریب آرہی تھی۔طلبہ نے اس تاریخ کے بعد اپنے اختیارات استعمال کرنے کا عندیہ دیا تھا۔

۲۳/اکتوبر کو محمد علی جوہر' ابوالکلام آزاد' حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ علی گڑھ پہنچ کر اولڈ بوائز لاج پر قابض ہو گئے۔ان کی آمد نے طلبہ کے جوش و خروش میں اچانک اضافہ کر دیا۔چھوٹے چھوٹے جلوس کالج میں گردش کرنے لگے۔عدم تعاون کے نعروں سے عمارت گونج رہی تھی۔کالج کی مسجد میں ایک جلسہ ہوا۔اس جلسے میں تقریر کرتے ہوئے محمد علی جوہر نے صاف الفاظ میں طلبہ سے کہا' وہ اپنے مربیوں کی بات نہ مانیں بلکہ خدا کی مانیں۔اسی جلسے میں انہوں نے اپنی قومی یونیورسٹی کی اسکیم بیان کی۔

"اگر موجودہ پرنسپل نے پرنسپل شپ قبول کرنے سے انکار کیا تو میں خود اس کا پرنسپل ہوں گا۔اس قومی یونیورسٹی میں جو لوگ تدریسی خدمات انجام دیں گے' ان کے نام

میرے پاس محفوظ ہیں۔''

انہوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ ۲۹ر اکتوبر بعد نماز جمعہ اس نئی یونیورسٹی کا افتتاح ہو گا۔اس جلسے کے بعد محمد علی جوہر نے فرداً فرداً اسٹاف کے ممبروں کو بلایا۔ ضیاء الدین بھی ان سے ملاقات کے لیے گیا۔

''میرے خیال میں آپ کے تمام اقدام اس طرف جاتے ہیں کہ علی گڑھ کالج مکمل طور پر ختم ہو جائے''ضیاء الدین نے محمد علی جوہر سے کہا۔

''طلبہ تو وہی رہیں گے''محمد علی جوہر نے کہا۔

''بے شک وہی رہیں گے لیکن آپ کا مقصد انہیں ایک ایسی جماعت میں تبدیل کر دینا ہے جو گاندھی کے پروپیگنڈے اور خلافت کے لیے کام کرے گی۔''

''ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔آپ ہمارا ساتھ دیجئے اور نئی قومی یونیورسٹی میں پرنسپل شپ قبول کیجئے۔''

''ملک میں مختلف یونیورسٹیوں کا ہونا اچھی بات ہے لیکن اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ علی گڑھ کالج کو ختم کر دیا جائے۔''

''پھر آپ گورنمنٹ سے قطع تعلق کر لیں۔''

''گورنمنٹ کی امداد کے بغیر کوئی تعلیمی ادارہ کیسے چل سکتا ہے؟''

''ہم گورنمنٹ کو یہ بھی کر کے دکھا دیں گے۔''

یہ بحث کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔ضیاء الدین احمد مایوس ہو چلا آیا۔محمد علی جوہر اور دیگر حضرات نے کالج سے نکل کر رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے شہر میں تقریریں کیں۔علی گڑھ کالج کی انتظامیہ کی مذمت کی گئی۔لوگوں کے جذبات اتنے بھڑک گئے کہ تشدد پر آمادہ ہو گئے۔محمد علی ضد کے پکے تھے۔انہوں نے جو کہا تھا کر دکھایا۔۳۰ر اکتوبر سے نئی قومی یونیورسٹی کے لیے داخلوں کا آغاز کر دیا گیا۔بند کمروں کے تالے توڑ کر انہیں کھول دیا گیا۔

اب یہ بات طے تھی کہ جب تک محمد علی جوہر کالج میں موجود ہیں، اس وقت تک قبضہ ختم نہیں کرایا جا سکتا۔ کالج کے ٹرسٹیوں نے ایک ریزولوشن پاس کیا اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے سپرد کر دیا کہ جو لوگ کالج پر قابض ہیں انہیں نکالا جائے۔ مجسٹریٹ نے مناسب مواقع پر پولیس تعینات کر دی۔ کالج میں پولیس کی تعیناتی غیر معمولی بات تھی۔ محمد علی جوہر نے نقص امن سے بچنے کے لیے فوری طور پر کالج چھوڑ دیا اور دروازے کے باہر بنگلوں میں مقیم ہو گئے۔ اس کے احاطہ میں ۲۰ کیمپ طلبہ کے نصب کیے گئے اور محمد علی جوہر کی قومی یونیورسٹی نے کام شروع کر دیا۔

☆☆☆

کالج کو یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کی کوششیں مسلسل جاری تھیں اور بالآخر ایک طویل قانونی جنگ کے بعد دسمبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ کالج، مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔

۱۹۲۰ء میں برصغیر کی سیاست کا پورا ریلا علی گڑھ کالج کی طرف تھا۔ یہ تاریخ کا ایسا لمحہ جس میں اگر ضیاء الدین کے قدم ڈگمگا جاتے تو نہ صرف کالج ختم ہو چکا ہوتا بلکہ یونیورسٹی کے قیام کی تمام امیدیں بھی پاش پاش ہو گئی ہوتیں۔ تحریک ترک موالات سے بخیر وخوبی گزر آنا اس کی زندگی کا وہ عظیم کارنامہ تھا جو مسلم یونیورسٹی کے سورج کے طلوع ہونے کا باعث بن گیا۔ اب یہ اس کا حق تھا کہ وہ اس نئی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنتا لیکن حکومت نے اس عہدے پر مہاراجا محمود آباد کا تقرر کر دیا۔ مہاراجا اس کے سخت مخالف تھے اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ کوئی عہدہ اسے ملے۔ مشکل یہ تھی کہ کوئی یورپین پرو وائس چانسلر بننے کو تیار نہیں تھا اور نہ کوئی مسلمان نظر آتا تھا جو حالات پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مہاراجا نے کڑوا گھونٹ پی لیا اور اسے پرو وائس چانسلر بنانا پڑا۔

مہاراجا نے یہ کڑوا گھونٹ پی تو لیا لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ ضیاء الدین کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھتے۔ مختلف اسامیوں پر تقررات ہوتے ان تک میں اس سے مشورہ لینا ضروری نہیں سمجھتے۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت آ گئی

کہ پرووائس چانسلر کے عہدہ پر رہنے کے باوجود ضیاء الدین کے ہاتھوں میں لیکچروں کی ترتیب کے سوا کچھ نہ رہا۔ اسے مجبور کر دیا گیا کہ وہ ٹریزرار اور رجسٹرار کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہ کرے۔ مزید لطف کی بات یہ تھی کہ مہاراجا اپنی مصروفیات کے باعث یونیورسٹی کے کاموں کے لیے بہت کم وقت نکال سکتے تھے۔

ان دشواریوں کے باوجود وہ اپنے تعلیمی تجربے اور اپنے اسٹاف کی مدد سے یونیورسٹی کی ترقی اور بقا کے لیے مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ داخلی مشکلات کے باوجود وہ بیرونی خطرات سے بڑی کامیابی سے نمٹ رہا تھا۔ بیرونی خطرات سے سب سے بڑا خطرہ چند فٹ کے فاصلے پر قائم ہونے والی نیشنل یونیورسٹی تھی۔ تمام سیاسی قوتیں مسلم یونیورسٹی کے نظام کو درہم برہم کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ نیشنل یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کے درمیان تصادم کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔

اسٹاف کے وہ چند اراکین جو تحریک عدم تعاون کے نتیجے میں کالج چھوڑ کر قومی یونیورسٹی میں شامل ہو چکے تھے' اب ایک خطرہ بن گئے تھے۔ طلبہ کو مسلم یونیورسٹی میں داخلے سے باز رکھنے کی ایک مستقل مہم جاری تھی۔ مخالفانہ خطوں اور تاروں اور ہیبت ناک افواہوں کا سلسلہ قائم تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ وائس چانسلر ہمیشہ موقع سے غائب رہتے تھے۔ تمام بار گراں اسی کے کاندھوں پر آ گیا تھا۔ وہ ان بکھیڑوں سے تنگ تو نہیں آیا تھا لیکن تھک ضرور گیا تھا۔ ۱۹۲۱ء کی چھٹیوں میں وہ یورپ چلا گیا تاکہ کچھ دماغی سکون حاصل ہو اور ریاضی کی جدید تحقیقات کا مطالعہ کر سکے۔

ابھی سفر کی تھکن بھی نہیں اتری تھی کہ ایک بحری تار اسے ملا۔ وائس چانسلر مہاراجا محمود آباد نے اسے فوری طلب کیا تھا۔ پرنس ویلس کے استقبال اور آنریری ڈگری پیش کرنے کا مسئلہ یونیورسٹی میں طے ہوا تھا۔ اس استقبال کے انتظام کے لیے اسے فوری طور پر بلایا گیا تھا۔ اب اس کے لیے یورپ میں وقت گزارنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے سامان سفر باندھا اور واپسی کی راہ لی۔

پرنس ویلس ابھی علی گڑھ نہیں پہنچے تھے، صرف لکھنواور بنارس کی یونیورسٹیوں کے دورے کا مزہ چکھا تھا، جو اتفاق سے بہت تلخ ہو گیا۔ طلبہ نے ان کے احترام شاہانہ کے خلاف مظاہرہ کیا تو علی گڑھ میں بھی تردد پیدا ہوا۔

''پرنس کا علی گڑھ پہنچنا خطرے سے خالی نہیں۔ یہاں اگر طلبہ نے ان کی شان کے خلاف نعرے بازی کی تو ہماری بہت بدنامی ہوگی لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ انہیں دہلی میں ڈگری پیش کی جائے'' مہاراجا نے تجویز پیش کی لیکن ضیاء الدین کو اس سے اختلاف تھا۔

''میں اس سے قطعی اختلاف کرتا ہوں۔ ہم انہیں اپنی یونیورسٹی میں ہی ڈگری پیش کریں گے۔''

''اگر آپ کی یہی ضد ہے تو خاموشی کے ساتھ انگلش ہاؤس میں یہ تقریب منالی جائے'' مہاراجا نے کہا۔

''میں اس تجویز سے متفق نہیں ہوں۔''

''پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''میں یہ چاہتا ہوں کہ نہایت شاندار استقبال کیا جائے اور اسٹریچی ہال میں ڈگری پیش کی جائے۔''

''اسٹریچی ہال میں!'' مہاراجا نے کہا ''آپ ایک باعزت انگریز کو طلبہ کے درمیان بے عزت ہونے کے لیے چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ طلبہ کی سیاسی کیفیت کا اندازہ ہے آپ کو؟''

''طلبہ کی ذمہ داری میں لیتا ہوں'' ضیاء الدین نے کہا ''مسلمان طلبہ کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جو ان کی قدیم روایات کے خلاف ہوگی۔''

مہاراجا مطمئن ہو گئے اور استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دفتر تعلیمات حکومت ہند کو بھی مطلع کر دیا گیا تھا لیکن حکومت اتنی ڈری ہوئی تھی کہ اس نے پرنس کا یہ دورہ منسوخ کر دیا۔ مہاراجا کو ایک موقع ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے ضیاء الدین کو بدنام کرنے کے

لیے حکومت ہند کا ایک خط حاصل کرلیا جس کا مفہوم یہ ہوسکتا تھا کہ چونکہ ڈاکٹر ضیاء الدین طلبہ کی ذمے داری لینے کو تیار نہیں ہیں اس لیے یہ دورہ منسوخ کیا جاتا ہے۔ ضیاء الدین بھی کب چوکنے والا تھا۔ اس نے فوراً وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری کو خط لکھا جس کے جواب میں اس نے تحریر کیا کہ وائسرائے کو یقین ہے کہ آپ نے ہمیشہ پرنس کو بلانے کی کوشش کی اور آپ نے برابر اس یقین کا اظہار کیا کہ ان کا یہ دورہ کامیاب ہوگا۔ اس خط نے ضیاء الدین کی بریت تو ظاہر کردی لیکن مہاراجا کے دل میں اس کی طرف سے ایک اور گرہ پڑ گئی۔ وہ دوبارہ یورپ جانا چاہتا تھا لیکن چھٹیوں کے باوجود مہاراجا نے اسے جانے نہیں دیا۔ یہ ناچاقی مزید رنگ دکھا سکتی تھی لیکن ان کی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے صوبے کے گورنر نے مہاراجا کو مستعفی ہونے پر مجبور کردیا تاکہ کوئی ایسا وائس چانسلر منتخب ہو سکے جس کے پاس یونیورسٹی کو دینے کے لیے وقت ہو۔

صاحب زادہ آفتاب احمد خاں بطور وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ ضیاء الدین نے سکھ کا سانس لیا کہ اب وہ یونیورسٹی کی ترقی کے لیے اپنی صلاحیتیں استعمال کرسکیں گے لیکن ان کا یہ خواب بہت جلد ٹوٹ گیا۔ صاحب زادہ کی بعض تقریروں اور روزمرہ کے کاموں میں مداخلت سے بہت جلد ایک ناخوش گوار صورت پیدا ہوگئی اور یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ ضیاء الدین کے ساتھ کوئی خاص مخالفانہ جذبہ کام کررہا ہے۔ انہوں نے ضیاء الدین سے کوئی مشورہ لینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ڈائننگ ہال کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خود ہی ٹھیکے دیے اور اس طرح کہ سارا نظام ہی درہم برہم ہوگیا۔ اس طرح کی بہت سی بے قاعدگیاں ہونے لگیں۔ ضیاء الدین ان حالات کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہا تھا لیکن اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا پھر اس نے یہی بہتر سمجھا کہ استعفیٰ دے کر دامن کش ہوجائے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین کی مسلسل کامیابیوں اور مقتدر حلقوں میں ان کی عزت و تکریم نے ان کے مخالفین کی تعداد میں اضافہ کردیا تھا۔ ایک طرف سیاست دانوں کا ایک گروہ تھا جو اس کا سخت مخالف تھا۔ دوسری طرف یونیورسٹی کے ہی وہ افراد تھے جو اس کی بڑھتی ہوئی

مقبولیت کو اپنے لیے خطرے کا باعث سمجھتے تھے۔ اس کے خلاف سازشوں کے جال بنے جاتے رہے۔ یہ سازشیں اس کی نیک نامی کو تو داغدار نہیں کر سکیں لیکن وہ استعفیٰ دینے پر مجبور ہو گیا۔ یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل نے اس کا استعفیٰ منظور کرتے ہوئے استحقاق رخصت کی جگہ چھ ماہ کی تنخواہ جو نو ہزار روپے بنتی تھی، منظور کی۔ اس نے ہمیشہ اپنی طرف سے یونیورسٹی کو کچھ دیا تھا، تنخواہ کے سوا کچھ لیا نہیں تھا۔ وہ تو دورے بھی اپنے خرچ سے کرتا تھا۔ اس نے یہ نو ہزار روپے بھی یہ کہہ کر واپس کر دیے۔

''افسوس ہے کہ میں اس زمانے کے حق رخصت کی تنخواہ قبول نہیں کر سکتا اور نہ میں اس چیز کو منظور کر سکتا ہوں جس کو میں اپنے زمانہ ملازمت میں جائز نہیں سمجھتا تھا۔''

☆☆☆

پارٹیوں، ڈنروں، پیش کشوں اور گروپوں کے جلسوں کے بعد شام وداع آ پہنچی۔

جب وہ ۱۹۰۶ء میں یورپ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے علی گڑھ آیا تھا تو اس کے طلبہ نے اس کی بگھی کو خود کھینچا تھا آج بھی اسے اسی عزت و تکریم سے رخصت کیا جا رہا تھا۔ بگھی کے گھوڑے کھول دیے گئے۔ طلبہ اسے کھینچتے ہوئے اسٹیشن پہنچے۔ یہ ان کی محبت کی انتہا تھی۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم طلبہ اور اسٹاف سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ رخصتی کا سماں قابل دید تھا۔ پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ دست بوسی کے لیے، ہاتھوں کے ہجوم کش مکش میں مبتلا تھے۔ ریلوے بابو کی وسل، انجن کی سیٹی، گاڑی کا رینگنا اور تالیوں کا شور۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی نظروں سے غائب ہو گئی۔

سب جسے آنکھوں میں رکھیں آہ وہ ہر دل عزیز
کارواں سے مثل یوسف یوں بچھڑ کر جائے ہائے

یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد مستقل ذریعہ آمدنی ختم ہو گیا۔ بارہ سو روپے ماہوار کی تنخواہ کا یکدم رک جانا معمولی بات نہیں تھی لیکن وہ ابتدا ہی سے کفایت شعار واقع ہوا تھا

اس لیے کچھ نہ کچھ پس انداز ہوتا رہا تھا۔ مختلف یونیورسٹیوں میں ممتحن بھی ہوتا تھا اور اس طرح ایک معقول رقم مل جاتی تھی۔ اس کے علاوہ میرس روڈ پر چھوٹے بڑے مکانات بھی تعمیر کرائے تھے۔ ان مکانوں کا اچھا خاصا کرایہ آجاتا تھا۔ یونیورسٹی سے سبکدوش ہوتے وقت پروفیسری اور وائس چانسلری کا بونس جو تقریباً پچاس ہزار تھا وہ انہیں ملا۔

☆☆☆

ایک بڑی میز کے اردگرد اعزہ اور دوستوں کے بچے تھے۔ اس نے ان بچوں کی دعوت کی تھی۔ اسے بچوں سے خاص شغف تھا اور ایسی مخصوص دعوتیں وہ اکثر کیا کرتا تھا۔ ایسے مواقع پر بچوں کی خاطر تواضع کرتے ہوئے وہ خود بچہ معلوم ہوتا تھا۔ خاندانی باورچی نے میز پر کھانا چن دیا تھا۔ تمام بچے مودب ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے سالن کا ڈونگا اس کے سامنے آیا۔ اس نے اپنے دائیں، بائیں بیٹھے ہوئے بچوں کی رکابیوں میں سالن نکالا اور پھر یہ ڈونگا آگے بڑھ گیا۔ گویا کھانے کا افتتاح ہو چکا تھا۔

وہ ابھی کھانے میں مشغول تھا کہ اپنے ایک قدیم شناسا حاجی صالح خاں شیروانی کی آمد کا اسے علم ہوا۔ وہ اس وقت دستر خوان سے نہیں اٹھ سکتا تھا اس لیے حاجی صاحب کو کچھ دیر کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ کھانے سے فراغت کے بعد اس نے حاجی صاحب سے ملاقات کی۔ حاجی صاحب سخت گھبرائے ہوئے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب، سخت ضرورت کے تحت آپ کے پاس آیا ہوں۔ بات عزت پر بن گئی ہے اور مجھے رقم کی اشد ضرورت ہے۔''

''حاجی صاحب، جب میں ہوں تو آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ کہیے کتنی رقم درکار ہے؟''

انہوں نے اپنی ضرورت بتائی۔ ضیاء الدین نے اپنے پس انداز سے ایک ایسا فنڈ قائم کر رکھا تھا جس سے اس کے احبا اور اعزہ کو بطور قرض مدد ملتی رہتی تھی، لیکن حاجی صاحب کی ضرورت بہت زیادہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ انہیں پریشان بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس

نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پچاس ہزار کی وہ رقم جو اسے یونیورسٹی سے ملی تھی، حاجی صاحب کو دینے کا وعدہ کر لیا۔ دوسرے دن حاجی صاحب اس قرضے کی دستاویز خود بنا کر لائے۔ ضیاء الدین نے اسے دیکھا تک نہیں اور رقم حاجی صاحب کے حوالے کر دی۔

۲۱ رمئی کو وہ یورپ روانہ ہو گیا۔ اس سفر کا اہم مقصد اپنی کتاب کے لیے جو نظام تعلیمات سے متعلق تھی، مواد جمع کرنا تھا۔ وہ ایسی کتاب لکھنا چاہتا تھا جو محض نظریات پر مبنی نہ ہو بلکہ مشاہدات پر مبنی ہو۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ممالک یورپ کے تعلیمی اداروں میں خود جائے۔ اساتذہ کو پڑھاتے ہوئے دیکھے اور پھر یہ نتیجہ اخذ کرے کہ ہندوستان کے لیے کس قسم کا نظام تعلیم مفید ہوگا۔ لندن پہنچ کر اس کی ملاقات ایک ٹیچر سے ہوئی جو نیوٹن کی اولاد میں سے تھے اور کونٹی کونسل کے اسکولوں کے انسپکٹر تھے۔ یہ ٹیچر اس کے ذوق علمی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ضد کر کے اسے اپنے مکان میں بطور مہمان ٹھہرایا۔

ضیاء الدین تو جو کام کرتا تھا، اسے انتہا تک پہنچا دینے کا قائل تھا۔ وہ جب اس ٹیچر کے ساتھ اسکولوں کے دورے پر نکلا تو صرف اساتذہ سے مل کر یا کلاسوں کے سرسری معائنے کو اپنی تحقیق کا مرکز نہیں بنا لیا بلکہ وہ عام طلبہ کے ساتھ کلاسوں میں بیٹھا اور اساتذہ کو پڑھاتے ہوئے دیکھا۔ دن بھر ان اسکولوں کی کلاسوں میں بیٹھنے کے بعد جب وہ لندن سے چودہ میل دور اپنے میزبان کے گھر پہنچتا اور رات کو اپنے مشاہدات قلمبند کرنے بیٹھتا تو اسے ہندوستان کا خیال آ جاتا۔ وہ دیر تک کھڑکی سے باہر چمکنے والے ستاروں کو دیکھتا رہتا۔ اسے اپنے وطن کی تعلیمی پستی کا خیال آتا اور اس کی آنکھیں بھر آتیں۔

لندن میں وہ اپنی تحقیق مکمل کر چکا تھا۔ وہ اپنے میزبان سے رخصت ہوا اور کیمبرج پہنچ گیا۔ طالب علمی کے زمانے کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ”کیا مجھے وہی کمرہ مل سکتا ہے جہاں میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں رہا کرتا تھا“ اس نے اپنے قدیم ٹیوٹر سے کہا جو ابھی تک کیمبرج میں تھا۔

”وہ کمرہ خالی تو نہیں ہے لیکن میں آپ کے لیے اسے خالی کرالوں گا۔“

ٹیوٹر کی مہربانی سے وہی کمرا مل گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی پچھلی یادوں نے یلغار کر دی۔ اس کمرے میں بند ہو کر اس نے اپنی کتاب کا خاکہ بنایا۔ دس دن کیمبرج میں گزارنے کے بعد وہ جرمنی گیا۔ یہاں کے وزیر تعلیم نے سرکلر جاری کر دیا کہ ضیاء الدین تمام اسکولوں کا معائنہ کر سکتے ہیں۔

جرمنی کے بعد وہ فرانس گیا۔ وہاں بھی یہ اجازت اسے مل گئی۔ برلن گیا اور گوٹنجن میں قیام کر کے کتاب لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ابھی نصف کتاب لکھی تھی کہ دانتوں کی تکلیف نے اسے بے حال کر دیا۔ یونیورسٹی اسپتال میں دانت نکلوائے گئے لیکن انجکشن لگانے میں ڈاکٹر سے کوئی غلطی ہو گئی جس کا اثر تمام نظام جسمانی پر پڑا۔ ایک مہینے تک اسپتال میں پڑا رہا اور بالآخر ہندوستان واپس آ گیا۔ وہ اٹاوہ میں مقیم تھا اور اپنی تصنیف کو مکمل کر رہا تھا جس کا آغاز اس نے انگلستان میں کیا تھا۔

کانگریس کی تحریک عدم تعاون شد و مد سے جاری تھی۔ اسی سلسلے میں اسمبلی کا بھی بائیکاٹ کیا گیا اور تمام کانگریسی ممبروں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے چند دوستوں نے مشورہ دیا کہ ان خالی نشستوں پر انتخاب ہو تو آپ الیکشن میں کھڑے ہو جائیں اور قانون ساز جماعت کے رکن بن کر ملک و قوم کو فائدہ پہنچائیں۔

اس سے پہلے اسے کسی ملکی الیکشن کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ جو نشست خالی ہوئی تھی، اس کا حلقہ انتخاب بھی کئی شہروں پر مشتمل تھا۔ اتنے وسیع حلقے میں کام کرنا اور الیکشن جیتنا آسان نہیں تھا لیکن یہاں بھی اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کام آ گئی۔ جب لوگوں کو اس کے ارادے کا علم ہوا تو کوئی اس کی مقابلے پر نہیں آیا اور یہ نشست اسے بلا مقابلہ حاصل ہو گئی۔ اسمبلی میں پہنچ کر اس نے انڈی پنڈنٹ پارٹی میں شرکت کی جس کے لیڈر قائد اعظم محمد علی جناح تھے۔

وہ جب پہلی مرتبہ اسمبلی میں گیا تو ریلوے کے میزانیے پر بحث ہو رہی تھی۔ ریلوے بورڈ کی طرف سے غلط بیانیوں کا ایک طویل سلسلہ جاری تھا۔ ضیاء الدین نے

ریلوے کے کارناموں اور بددیانتیوں کا پول کھولنے کے لیے نہایت محنت اور تحقیق سے مواد جمع کیا اور اعداد و شمار سامنے رکھ کر اس محکمے پر جو اعتراضات کیے، وہ اتنے گہرے اور مدلل تھے کہ ریلوے کے فنانشل کمشنر مسٹر پارسن کو یہ شبہہ ہوا کہ یہ تقریر ریلوے کے کسی افسر کی لکھی ہوئی ہے۔

''مسٹر، یہ آپ کے خیالات نہیں ہیں۔ ریلوے کے کسی افسر نے اندر کی باتیں آپ کو فراہم کی ہیں بلکہ شاید پوری تقریر ہی اس کی لکھی ہوئی ہے۔''

''آپ کا خیال صریحاً غلط ہے'' ضیاء الدین نے جواب دیا ''میں نے آپ سے زیادہ مشکل امتحان پاس کیے ہیں۔ بجائے اس کے کہ میں اپنی تقریر دوسروں سے لکھواؤں، اتنی قابلیت رکھتا ہوں کہ دوسروں کے لیے تقریر خود لکھ دیا کروں۔''

اس واقعے کے بعد تو وہ اور بھی ضد میں آ گیا۔ ریلوے کے معاملات میں اس نے اتنی دلچسپی لی کہ اتھارٹی بن گیا۔ اسمبلی میں ریلوے ممبر اس سے بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔

اسمبلی کا یہ انتخاب جس میں وہ کامیاب ہوئے تھے چونکہ عارضی تھا اس لیے آخر ۱۹۳۰ء میں اس کی میعاد ختم ہو گئی لیکن آئندہ سیشن کے لیے بھی بلا اختلاف منتخب ہو گئے۔ اسمبلی میں مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے ضیاء الدین کی شکل میں ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جو بہت زیادہ پڑھا لکھا تھا جس کی تحقیقات، منطقی ذہن اور زوردار مدلل تقریروں نے اسمبلی میں اپنا لوہا منوایا۔

۱۹۳۴ء میں سہ بارہ انتخاب ہوا۔ اب کانگریس اسمبلی میں آنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ کانگریس کی طرف سے یوسف امام کو مقابلے میں کھڑا کیا گیا حالانکہ کانگریس کا یہ عمل اس معاہدے کے منافی تھا جو اس کے اور مسلم یونیٹی بورڈ کے مابین ہوا تھا کہ کوئی جماعت ایک دوسری جماعت کے نامزد کردہ امیدوار کے مقابلے میں کسی کو کھڑا نہیں کرے گی۔ ضیاء الدین یونیٹی بورڈ کے ٹکٹ پر کھڑا ہوا تھا۔ کانگریس کی انتہائی جدوجہد اور زرپاشی کے

باوجود یوسف امام نہ صرف ناکام ہوئے بلکہ ان کی زرضمانت کی رقم بھی ضبط ہوگئی جو ایک بڑی ہار تھی۔

اس کے بعد کے دور میں مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاست میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ کئی مرتبہ چنگاری، شعلہ بنی۔ ضیاء الدین کی زبان شعلے برساتی رہی۔ وہ ہر مرتبہ منتخب ہوتا رہا اور ۱۹۴۷ء تک اسمبلی کے فلور پر چھایا رہا۔ اس کے بہترین معرکوں میں ریلوے کے مسائل، ریزرو بینک کا قیام، ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ، مزدوروں کے مسائل کے حل کے لیے جدوجہد، سرحدی قوانین پر تحریک التوا وغیرہ نے بڑی شہرت حاصل کی۔

وہ ماہر ریاضی تھا۔ ریاضی سے زیادہ الجھی ہوئی گتھیاں اور کسی علم میں شاذ ہی ملتی ہیں۔ ان گتھیوں کو سلجھاتے سلجھاتے اس کا دماغ ایسا منجھ گیا تھا کہ ہر چیز کی اچھائی یا برائی پرکھنے کی ایک خاص صلاحیت پیدا ہوگئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ معاشیات کے اصولوں سے ناواقف ہونے کے باوجود اس فن کا بڑا گہرا نقاد بن گیا۔ مسلمانوں کے اقتصادی معاملات اور ہندوستان کی معاشی حالت کا وہ اس طرح تجزیہ کرتا کہ ماہرین معاشیات کا طبقہ اس کی معلومات پر حیران رہ جاتا۔ اس کے خیالات مستقل کتابوں کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اسمبلی میں اس کی موجودگی اتنی ہی ضروری ہوگئی تھی جتنی کبھی مسلم یونیورسٹی میں تھی۔

اب وہ یونیورسٹی میں نہیں تھا۔ اس کی غیر موجودگی کے سات برسوں میں بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ سرسید کے پوتے سرراس مسعود، مسعود جنگ وائس چانسلر تھے لیکن ان کا پورا دور اندرونی سازشوں اور بدانتظامیوں سے عبارت رہا۔ اخراجات سال بہ سال بڑھ رہے تھے جن میں کمی لانے کے لیے مختلف اقدامات کیے جا رہے تھے۔ پرووائس چانسلر کے عہدے پر ایک انگریز فائز تھا۔ اس کے گراں قدر مشاہرات بجٹ پر سخت بار تھے لہٰذا آئندہ پرووائس چانسلر کا عہدہ ہی ختم کر دیا گیا۔ رجسٹرار کی مدت ملازمت ختم ہوئی تو آئندہ توسیع کی ممانعت ہوئی۔ اسی طرح دیگر مدات میں بھی کمی کی گئی۔ اس موقع پر راس مسعود نے یہ ترمیم چاہی کہ رجسٹرار کو واپس نہ کیا جائے کیونکہ پرووائس چانسلر کا عہدہ حذف ہو جانے سے

ان پر دہری ذمے داریاں عائد ہوگئی تھیں لیکن کورٹ نے اس ترمیم کو بھاری کثرت رائے سے نامنظور کردیا۔ نتیجے میں سر راس مسعود نے استعفیٰ دے دیا۔

گورنر صوبہ سر ہیری ہیگ نے ضیاء الدین کو لکھنو طلب کیا اور وائس چانسلری کا امیدوار بننے کے لیے آمادہ کرنا چاہا۔

''جناب مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن اس صورت میں ہز ہائی نس چانسلر نواب صاحب بھوپال اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں گے۔''

''حکومت تو خود یہ چاہتی ہے کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔''

''اس سے جو ممبر آف کورٹ میں بے چینی ہوگی؟''

''اگر انہوں نے استعفی دیا تو ہم کوئی اور انتظام کرلیں گے۔''

اس یقین دہانی کے بعد ضیاء الدین نے رضا مندی دے دی۔ اس کے مقابلے میں نواب محمد اسمٰعیل خاں وائس چانسلری کے امیدوار تھے۔ سر شاہ محمد سلیمان جج (ہائی کورٹ الہ آباد) کی صدارت میں کورٹ کا اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر انصاری اور مولانا شوکت علی اس کی مخالفت کرنے والوں میں نمایاں تھے لیکن رائے شماری میں ضیاء الدین کا انتخاب ہو گیا۔ نواب صاحب بھوپال نے اس کے منتخب ہوتے ہی چانسلر شپ سے استعفی دے دیا۔

ضیاء الدین نے منتخب ہوتے ہی یونیورسٹی کی ترقی کے متعلق اقدامات شروع کر دیے۔ یہ کوششیں ہی اس کے نکتہ چینیوں کا جواب ہو سکتی تھیں۔ اب وہ بااختیار وائس چانسلر تھا۔ نواب بھوپال کی مخالفتوں کا دور بھی گزر چکا تھا۔ اب وہ اپنے کئی خوابوں کی تکمیل کر سکتا تھا۔

بہت دنوں سے ایک انجینئرنگ کالج کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی لیکن کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جاسکا تھا۔ ضیاء الدین نے ایک بہت چھوٹے پیمانے پر ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا اجرا کیا جو رفتہ رفتہ مستقل کالج بن گیا۔ زنانہ کالج موجود تھا لیکن یہ انٹر کالج تھا۔ اسے ڈگری کالج پر ترقی دی گئی اور آرٹس کے علاوہ بی ایس سی تک تعلیم سائنس کا اجرا ہوا۔ طبیہ کالج بورڈ

آف میڈیسن، یو پی کے ماتحت قائم ہوا تھا مگر ضیاء الدین نے اپنے عہد اقتدار میں اسے ایک آزاد مستقل کالج بنا کر تعلیم و امتحانات کی نگرانی یونیورسٹی کے تحت کر دی۔

اسی طرح اس کی کوششوں سے میڈیکل کالج زراعتی کالج اور کامرس کالج کی اسکیمیں پیش کیں۔ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں کا اجرا ہوا اور ریسرچ کے وظائف کی تعداد بڑھا دی۔ مختلف شعبوں کی تعلیم کا معیار بلند ہوا۔ دینیات اور السنہ مشرقی کا ایک مخصوص نصاب جاری کیا گیا۔ علم النفس کے مطالعہ و تحقیق کے لیے لیبارٹری قائم کی اور اسلامی فلسفے کو ایک خاص مضمون قرار دیا گیا۔

ان مصروفیات نے گزرتے ہوئے دنوں کی رفتار اتنی بڑھا دی کہ دیکھتے ہی دیکھتے تین سال کا عرصہ گزر گیا اور جدید انتخاب کا موقع آ گیا۔ اس مرتبہ پھر نواب محمد اسماعیل اس کے مدمقابل آئے لیکن مسلم سیاست کی اس وقت جو صورت حال تھی، اس کے لحاظ سے آپس کا یہ اختلافی ہنگامہ دوسروں کو ہنسنے کا موقع فراہم کرتا، لہٰذا کورٹ کے اراکین کے مشورے سے دونوں امیدواروں نے اپنے نام واپس لے لیے اور سر شاہ محمد سلیمان کا انتخاب کر لیا گیا۔ ۱۹۴۰ء میں سر شاہ محمد سلیمان کی غیر متوقع وفات سے ایک مرتبہ پھر وائس چانسلر شپ کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آ گیا۔

ضیاء الدین کا نام پیش ہوا لیکن اب صورت حال پہلے سے بھی زیادہ اس کے خلاف تھی۔ حیدر آباد میں سر اکبر حیدری اور پنجاب میں سر سکندر حیات اس کے مخالف امیدوار تھے۔ سر شیخ عبدالقادر کی وجہ سے پورا حیدر آبادی گروہ اس کی مخالفت پر اتر آیا۔ نظام حیدر آباد چانسلر تھے اس لیے شیخ عبدالقادر کو زبردست اخلاقی سہارا حاصل تھا۔

ضیاء الدین کو الیکشن کے داؤ پیچ کا کچھ ایسا اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا اندازہ کبھی غلط ہی نہیں ہوتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہوتا تھا کہ کون اسے ووٹ دے گا کون نہیں۔ کس پر محنت کرنے کی ضرورت ہے کس پر نہیں۔ جہاں لوگ پانی کی طرح پیسے بہاتے تھے وہاں وہ صرف تعلقات سے کام نکال لیتا تھا۔ اس کے پاس صرف چھ سیٹوں کی موٹر تھی جو کچے پکے

راستوں پر دوڑتی رہتی تھی۔ اس انتخاب کے موقع پر بھی اس کی موٹر دوڑ رہی تھی۔ علی گڑھ میں بہار آئی ہوئی تھی۔ جا بجا مہمان خانے کھلے ہوئے تھے۔ انتخابی لٹریچر تقسیم ہو رہا تھا۔ بگھی اور تانگے دوڑ رہے تھے۔

تاریخ انتخاب سے دو دن قبل سر سکندر کا ایک گشتی خط ممتاز اراکین کورٹ کے نام موصول ہوا جس میں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اگر ڈاکٹر ضیاء الدین کا انتخاب ہوا تو حیدر آباد کی ہمدردیاں زائل ہو جائیں گی اور گرانٹ بھی متاثر ہو جائے گی۔ یہ رائے دہندگان پر اثر ڈالنے کی آخری کوشش تھی جو اس وقت ناکامی سے دوچار ہوگئی جب سہ پہر کے دوسرے اجلاس میں ۱۸۳ ارکان نے بلا اختلاف ضیاء الدین کا انتخاب کر دیا۔

اس انتخاب کے بعد بھی اس کے خلاف پروپیگنڈے کا زور تھما نہیں۔ حیدر آبادی گروہ اس میں پیش پیش تھا۔ اخبار ''پیام'' اس کے خلاف مسلسل اداریے لکھ رہا تھا۔ اسے اپنی کردار کشی کی فکر نہیں تھی، یہ فکر تھی کہ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر نظام حیدر آباد کی جانب سے ملنے والی گرانٹ بند نہ ہو جائے۔

وہ مادر دکن کی رحلت پر تعزیت کرنے کے لیے حیدر آباد گیا۔ یہ موقع ایسا تھا کہ نظام نے نہایت اخلاق و مہربانی کے ساتھ اسکی پذیرائی فرمائی۔ نظام نے یہ فرمان بھی جاری کیا کہ یونیورسٹی میں بہ یادگار مادر دکن صرف خاص سے ''مسجد زہرا'' کے نام سے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی جائے۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران میں، نظام نے کئی مرتبہ شرف ملاقات بخشا اور یونیورسٹی کے معاملات سے دلچسپی کا اظہار کیا۔

جب یہ خبریں اخبارات میں چھپنے لگیں تو اس کے خلاف لگنے والی خبریں خود بخود دم توڑنے لگیں۔ نظام جس کی تعریف کر رہا ہو کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف لکھتا پھر تو یہ ہوا کہ ڈاکٹر ناظر یار جنگ نے جو صف مخالفین کے علم بردار تھے، اسے ایک شاندار عصرانہ دیا۔ طلبائے قدیم کی طرف سے جن میں مخالفین بھی شامل تھے، ایک سپاس نامہ پیش ہوا جس میں اسے دوبارہ منتخب ہونے پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا گیا تھا۔

''ہمارے ادارہ علمی سے آپ کی بے انتہا محبت شہرہ آفاق ہے۔آپ ان چند خدمت گزاران جامعہ سے ہیں جن پر سرسید کی روح فخر کر سکتی ہے۔ہماری جامعہ نے آپ کی بے لوث خدمت سے جتنا بھی فائدہ اٹھایا ہے' وہ امکان بیان سے باہر ہے۔آپ کے گزشتہ کارنامے ہماری درسگاہ کی تاریخ کے زریں باب ہیں۔''

وہ حیدر آباد سے واپس آیا تو اس کی حکمت عملی نے اس پروپیگنڈے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔

☆☆☆

ہندوستان کی سیاست اب اپنے عروج پر تھی۔مسلم لیگ اور کانگریس کے راستے الگ الگ ہو چکے تھے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر دونوں سیاسی جماعتوں کی نظر تھی۔مسٹر گاندھی' پنڈت نہرو' خان عبدالغفار وغیرہ کی آمد اور یونین میں ان کی تقریروں سے طلبہ میں کانگریسی ذہنیت پیدا ہو چکی تھی۔طلبہ کے ایک حصے میں ''کمیونزم'' بھی قدم جما رہا تھا۔

ضیاء الدین مسلم لیگ کی پالیسی سے متفق تھا۔وہ یونیورسٹی کو سیاست کا اکھاڑا بنانا نہیں چاہتا تھا لیکن جب کانگریسی اثرات طلبہ میں سرایت کرنے لگے تو اسے اپنی حکمت عملی تبدیل کرنا پڑی۔اس نے صاف اعلان کر دیا۔

''یہ یونیورسٹی چونکہ مسلم یونیورسٹی ہے اس لیے کوئی مسلم یا غیر مسلم طالب علم یا معلم مذہبی احکام کا تمسخر کر کے ان پر نکتہ چینی ہرگز نہیں کر سکتا۔''

ہر ایک طالب علم کو ڈسپلن کے قواعد وضوابط کی پابندی کرنا لازمی ہے۔اگر کوئی طالب علم ہمارے مذہب کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی ظاہر کرے گا یا ہماری درسگاہ کے ساتھ بے وفائی ظاہر کرے یا مقررہ قواعد وضوابط کی پروانہ کرے تو اسے اس درس گاہ میں رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔اس نے سیاسی خیالات اور ذہنیت کی اصلاح ایسے غیر محسوس طریقے سے کی کہ انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد اس نے مزید کھلے لفظوں میں طلبہ کو مخاطب کیا۔

''یونیورسٹی دراصل ایک علمی ادارہ ہے لیکن اس کی زندگی میں مسلم رائے عامہ کے رجحان کا عکس آنا ضروری ہے۔ میں خود مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کا رکن ہوں اور مجھے یقین ہے کہ مسلم لیگ ہی وہ واحد جماعت ہے جو مسلم قوم کے مفاد اور حقوق کی حفاظت کر سکتی ہے۔

اس کے بعد یونیورسٹی میں پھر اس ذہنیت ہی کا خاتمہ ہو گیا چنانچہ ۱۹۴۶ء میں یونین کے انتخابات کانگریس اور لیگ کے درمیان ہوئے اور بڑے معرکے کے ہوئے۔ طلبہ نے بڑی محنت' انہماک اور جوش سے کام کیا اور بالآخر مسلم لیگ کو کامیابی حاصل ہوئی۔

☆☆☆

عبدالقدیر رضوی نامی ایک طالب علمی نے جو میگزین کا ایڈیٹر بھی تھا' میگزین کی ایک اشاعت میں کانگریس گورنمنٹ اور ہندوؤں کے خلاف ایک سخت قسم کا اشتعال انگیز اداریہ شامل کر دیا۔ اس میگزین کی پوری اشاعت بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ اداریہ مجسٹریٹ ضلع کے نوٹس میں آ گیا۔ مجسٹریٹ نے وائس چانسلر کی حیثیت سے ضیاء الدین کی توجہ اس طرف دلائی۔

''آپ جانتے ہیں' اگر یہ اداریہ یونیورسٹی سے باہر نکل گیا تو کیا ہو سکتا ہے۔ آپ کی یونیورسٹی پہلے ہی مشکلات سے دوچار ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یونیورسٹی سینسر موجود ہے۔ سینسر جب تک منظوری نہ دے 'کوئی چیز چھپتی ہی نہیں۔''

''ہو سکتا ہے یہ اداریہ سینسر کے علم میں لایا ہی نہ گیا ہو' مجسٹریٹ نے کہا اور ساتھ ہی شائع ہونے والا میگزین بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔

مجسٹریٹ کے جانے کے بعد ضیاء الدین نے میگزین کی تمام کاپیاں منگوا لیں۔ تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ اس سازش میں بعض اسٹاف ممبران بھی

شامل ہیں۔ دوسری طرف طلبہ کے ایک گروہ نے یہ افواہ پھیلا دی کہ وائس چانسلر، علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ طلبہ میں غم و غصہ پھیل گیا اور انہوں نے وائس چانسلر کے دفتر کا رخ کیا۔ دو تین طلبہ اندر داخل ہوئے اور ضیاء الدین سے استعفیٰ مانگا۔

"کیا تم نہیں چاہتے کہ میں یونیورسٹی کی خدمت کروں؟"

"ہمیں استعفیٰ چاہیے" لڑکوں نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اس کی طرف بڑھا دیا۔

"سوچ لو، پھر تم کہو گے بھی تو میں استعفیٰ واپس نہیں لوں گا۔"

"ہمیں آپ کا استعفیٰ چاہیے۔"

آج تک اس کے کسی طالبعلم نے اس سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ اس نے ایک نظر ان طلبہ کی طرف دیکھا اور اپنا استعفیٰ لکھ کر ان کے حوالے کر دیا۔

یہ خبر جیسے ہی تمام یونیورسٹی میں مشتہر ہوئی، طلبہ کی اس جماعت کے غیر مہذب اور خود سرانہ کاروائی سے طلبہ میں اشتعال پیدا ہوا۔ وہ فوراً یونین کلب میں جمع ہوئے اور ضیاء الدین کو استعفیٰ واپس لینے پر مجبور کیا۔ ضیاء الدین کو معلوم تھا کہ اگر وہ استعفیٰ واپس لیتے ہیں تو طلبہ کے دو گروہوں میں تصادم بھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ایک مبہم سا جواب دے کر وقتی طور پر طلبہ کو مطمئن کر دیا۔

کورٹ کی اسپیشل میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں بھی ضیاء الدین پر زور دیا گیا کہ وہ استعفیٰ واپس لے لے لیکن وہ اب استعفیٰ واپس لینے پر تیار نہیں تھا بالآخر قائداعظم، نواب زادہ لیاقت علی خان اور بعض بااثر ممبران کے مشورے سے زاہد حسین کا نام تجویز ہوا جو علی گڑھ کے ایک ممتاز طالب علم تھے۔ کورٹ کی اگلی میٹنگ میں زاہد حسین وائس چانسلر مقرر ہو گئے۔

علی گڑھ ۱۹۴۱ء سے پاکستان کا جذباتی مرکز بن گیا تھا۔ ضیاء الدین کی کوششوں سے طلبہ میں اسلامی خیالات کا چرچا ہوا تھا اور مسلمان لیڈروں کی قدر و منزلت کی جانے لگی

تھی۔طلبہ کے سینے اسلامی قومی جوش سے بھر گئے تھے۔

ضیاء الدین کے جانشین زاہد حسین تقریباً ساڑھے تین مہینے بعد ہی مستعفی ہو گئے۔ان کے بعد نواب محمد اسمٰعیل خان وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ان کی قابلیت میں شک نہیں تھا لیکن بھارت کی مرکزی حکومت اور شعبہ تعلیم کی وزارت انہیں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔انہوں نے ۱۹۴۸ء میں استعفیٰ دے دیا۔آخر کار قرعہ فال ڈاکٹر حسین خاں کے نام نکلا جو سرگرم کانگریسی رکن رہ چکے تھے۔

ڈبلیو سی اسمتھ نے اپنی کتاب ''ہندوستان میں موجودہ اسلام'' میں اس یونیورسٹی کے متعلق لکھا۔

''۱۹۳۷ء میں ہی یہ ادارہ مسلم لیگ کے زیر اثر آ گیا اور اس کی آزاد خیالی مذہبی جوش' تنگ نظری اور غیر قومی خیالات میں بدل گئی۔ایک فرقے کی یونیورسٹی ہماری غیر مذہبی ریاست میں کوئی موزوں جگہ حاصل نہیں کر سکتی تھی نہ وہ حالات کی اہم ضرورتوں کو پورا کر سکتی تھی۔''

ضیاء الدین کی موجودگی میں مسلم یونیورسٹی کی مخصوص پہچان برقرار رہی لیکن اس کے یونیورسٹی سے نکلتے ہی کانگریس کا غلبہ بڑھنے لگا اور پھر کچھ دن بعد تو کوئی امید رکھی ہی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ پاکستان بن چکا تھا۔

☆☆☆

وائس چانسلر شپ سے استعفیٰ دینے سے اس کی مالی حالت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔اس کی گزر اوقات یونیورسٹی کی تنخواہ پر نہیں تھی۔یورپ کی کئی نئی کمپنیوں کی ایجنسیاں لے رکھی تھیں۔اس ہیر پھیر میں اس کو معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔رہنے کے لیے ایک بڑی کوٹھی تھی۔اس کے علاوہ پانچ چھوٹی کوٹھیاں ایک ہی احاطے میں تھیں۔ذکا منزل ایک نئی کوٹھی اپنے لڑکے کے لیے بنوائی تھی۔کرائے کی مد سے تقریباً چھ ہزار سالانہ کی آمدنی ہو جاتی تھی۔ترک ملازمت کے بعد وہ تنہائی کا شکار بھی نہ ہو سکا۔اس کے تعلقات کا دائرہ

ہندوستان سے یورپ اور مصر وافریقہ تک پھیلا ہوا تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر تھی کہ ریاضی میں بی اے کے باعث تمام مسلمانوں کی مسرت آمیز توجہ کا مرکز بن گیا۔ اسی سال کالج میں وہ اسٹنٹ پروفیسر ہو گیا۔ اتنی کم عمری میں یہ بھی کوئی کم انوکھی بات نہیں تھی۔ قومی کاموں کی دلچسپی کی وجہ سے بھی خاصی شہرت حاصل کر لی۔

ایک دائرہ وہ تھا جو ان طلبہ کے درمیان پھیلا ہوا تھا جو علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ ان میں پرنس، بڑے بڑے امراء اور زمیندار شامل تھے۔ ایسے طلبہ بھی تھے جن کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے اس نے وسائل بہم پہنچائے تھے اور اس کی سفارش سے برسر روزگار ہوئے اور اعلیٰ مناصب پر پہنچے۔ احاطہ علی گڑھ کے باہر اس کے دائرہ تعلقات میں اعلیٰ حکام، والیان ملک، بڑے چھوٹے تعلقہ دار و زمیندار غرض ہر طبقے اور ہر درجے کا شخص شامل تھا۔ ایک دائرہ یورپ اور امریکا میں تھا۔ وہاں یونیورسٹیوں میں جو ساتھی تھے، ان سے دوستانہ مراسم تھے۔ ان میں سے اکثر بڑے بڑے مدارج پر پہنچے۔ مسلمان مشاہیر میں سر آغا خان، سر اکبر حیدری، سر عبدالرحیم، سر فضل حسین وغیرہ اس کے پرستار تھے۔ مرکزی اسمبلی کے متعدد ممبروں کے ساتھ بے تکلفانہ مراسم تھے۔

ان تعلقات کی موجودگی میں نہ تو وہ تنہائی کا شکار ہو سکتا تھا نہ اس کا کوئی کام رکا رہ سکتا تھا، فرصت کے اوقات میں وہ اکثر یورپی ممالک کا رخ کیا کرتا تھا تاکہ وہاں کی تعلیمی ترقیوں کا مطالعہ و مشاہدہ کر سکے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ اسی نیت سے انگستان روانہ ہوا اور پھر امریکا اور فرانس کا دورہ کیا۔ نومبر میں واپسی کا ارادہ تھا۔ اپنے داماد ڈاکٹر قیوم پاشا کو اطلاع بھی دے چکا تھا اور ہوائی جہاز میں نشست بھی محفوظ کرا لی تھی کہ اسے ہز ہائی نس آغا خان کا خیال آیا۔ ان سے ملنا ضروری تھا۔ ان کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ پیرس میں ہیں، لہٰذا وہ ان سے ملنے پیرس گیا۔

ان سے ملاقات کے بعد وہ پیرس سے لندن آ رہا تھا کہ اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ معمولی حملہ تھا۔ جہاز میں طبی امداد مل گئی، لیکن لندن پہنچتے ہی وہ نرسنگ ہوم میں داخل ہو

گیا۔ ابھی فالج کا اثر پورے طور پر دور نہیں ہوا تھا کہ نمونیا میں مبتلا ہو گیا۔ حالت سنبھلتی، بگڑتی رہی۔ ڈاکٹر قیوم پاشا بھی کراچی سے اس کے پاس پہنچ گئے۔ انڈیا ہائی کمشنر مسٹر کرشنا مینسن نے مشورے کے لیے مدراس کے مشہور ڈاکٹر ہینڈو کو بھی لندن بلا لیا۔ بادشاہ کے خاص فزیشن ڈاکٹر لارڈ ہوڈر بھی اس اس کے علاج میں مشاورت کرتے رہے۔ ان سب کوششوں نے یہ اثر دکھایا کہ اس کی حالت سنبھل گئی۔ حالت سنبھلتے ہی مختلف وفود اس سے ملاقات کے لیے آنے لگے۔

ایک روز نوجوان طالب علموں پر مشتمل ایک وفد اس سے ملاقات کے لیے آیا۔ وہ بستر پر لیٹا تھا۔ حالت سنبھلی ہوئی تھی لیکن نقاہت بہت تھی۔ کمزور آواز میں وہ ان طلبہ سے مخاطب تھا۔ اس وقت بھی اسے فکر تھی تو ان طلبہ کے مستقبل کی۔

"آپ لوگ پہلی فرصت میں ہندوستان واپس جائیں۔ وہیں رہیں اور وہیں کام کریں۔"

"وہاں جا کر ہم کیا کریں گے؟" طلبہ نے کہا "مسلمانوں کے لیے وہاں ملازمتیں کہاں ہیں؟"

"مجھے معلوم ہے مسلمانوں کو ملازمتیں نہیں ملیں گی اور میں اس سے خوش ہوں۔ اس لیے کہ تعلیم یافتہ مسلمان تجارت' زراعت' صنعت و حرفت اور صحافت وغیرہ کی طرف متوجہ ہوں گے اور اسی قسم کے کام انہیں کرنے چاہئیں۔

اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ حالت اچانک بگڑنے لگی۔ اسے پھر نرسنگ ہوم میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے معالج ڈاکٹر غیاث الدین تھے جو اسے دیکھنے آئے تھے اور ضروری انجکشن وغیرہ دے کر اس کے قریب ہی کرسی ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے۔

"ڈاکٹر غیاث!" اس نے آہستہ آواز سے پکارا۔

"حکم۔"

"حکم نہیں وصیت" ضیاء الدین نے کہا "تم اب ہندوستان جا کر کام کرو۔ تم جیسے

آدمی کی وہاں ضرورت ہے۔اب مسلمانوں کی تعلیم وہاں اہم مسئلہ ہوگا۔'' اس کے ساتھ ہی اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا دماغ ہندوستان سے آگے کچھ سوچنے کے لائق نہیں رہ گیا ہے۔جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ اب وہ واپس ہندوستان نہیں جا سکتا۔جیسے وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو ہندوستان بھیج دینا چاہتا ہے۔مسلمانوں کی تعلیم کے لیے زندگی بھر جنگ لڑنے والا، بستر موت پر بھی مسلمانوں کی تعلیم سے غافل نہیں تھا۔

وہ بے ہوش تھا۔اسے ہوش میں لانے یا دوسرے لفظوں میں زندگی بچانے کے لیے تدبیریں کی جارہی تھیں۔ایک مرتبہ اس نے آنکھیں کھولیں۔اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''اگر میں مرجاؤں تو میری تدفین علی گڑھ میں کی جائے۔'' اس نے آخری کلمات ادا کئے اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔اس کے بعد کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔یہ ۲۳ر دسمبر کی صبح تھی۔

ہائی کمشنر پاکستان مسٹر ابراہیم نے غسل اور کفن کا انتظام کیا اور انگلستان کے دستور کے مطابق انڈرٹیکر کے ذریعے تجہیز و تدفین ہوئی۔لندن کے اسلامک سینٹر ریجنس لاج میں نماز جنازہ ہوئی۔یہ مرکز مصری اصحاب نے قائم کیا تھا۔وہ دیارِ غیر میں تھا لیکن علی گڑھ کے طلبائے قدیم یہاں اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ اسلامک سینٹر تھوڑی دیر کے لیے علی گڑھ کا منظر پیش کرنے لگا۔ہندوستان اور پاکستان کے معززین کا ایسا مجمع بھی کبھی دیکھنے میں نہیں آیا ہوگا جیسا اس وقت تھا۔

اس کی وصیت کے مطابق اس کی میت کو علی گڑھ میں دفن کرنا تھا اس لیے لاش انجکشن کے ذریعے محفوظ اور تابوت میں بند کر کے بحری جہاز کے ذریعے بمبئی روانہ کردی گئی۔لندن میں وزارت خارجہ کے سیکریٹری سر گرجا شنکر باجپائی نے لاش کو بمبئی سے علی گڑھ تک لے جانے کے سلسلے میں ریلوے انتظام کے متعلق آسانیاں بہم پہنچانے کے لیے

گورنمنٹ بمبئی کو ہدایات کیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل کو بھی تار دے دیا تھا کہ وہ قبر وغیرہ کے انتظامات مکمل کرلیں۔

تار ملتے ہی ایگزیکٹو کونسل کا اجلاس شروع ہو گیا۔ اس اجلاس نے قبر کے لیے جگہ تجویز کی۔ دوسری اور تیسری فروری ۱۹۴۸ء کی درمیانی شب کو اس کا جنازہ علی گڑھ اسٹیشن پہنچا۔ آہوں اور سسکیوں کی ہمراہی میں اس کا تابوت کوٹھی ذکا منزل پہنچا دیا گیا۔

دوسرے دن تدفین عمل میں آنا تھی۔ شہر کے لوگ جوق در جوق اسے آخری بار الوداع کہنے کے لیے کرکٹ لان پر جمع ہو رہے تھے۔ اس دن حکام ضلع نے دفاتر بند کر دیے تھے۔ عام تعطیل کا اعلان تھا اس لیے وقت کے ساتھ ساتھ مجمع بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ابھی اس کا تابوت کوٹھی سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ طلبہ میں بے چینی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ کچھ دیر کچھ طلبہ ادھر سے ادھر بھاگتے ہوئے نظر آئے' پھر سرگوشیاں بڑھنے لگیں۔ چہروں پر طیش اور غصے کی تحریریں ابھرنے لگیں۔

"ہم ڈاکٹر صاحب کو ایگزیکٹو کونسل کی تجویز کردہ جگہ پر ہرگز دفن نہیں کرنے دیں گے۔ یہ جگہ کسی طرح ان کے شایان شان نہیں ہے۔ نظروں سے اوجھل ایک گوشے میں واقع ہے۔"

"ہم کونسل کی قرارداد کے خلاف عمل نہیں کر سکتے۔" یونیورسٹی افسران نے کہا۔

طلبہ کا مطالبہ تھا کہ سرسید مرحوم کے مقبرے کی مغربی بارہ دری میں قبر بنائی جائے جس طرح مشرقی بارہ دری میں سید راس مسعود کی ہے۔

"۱۹۰۵ء کے بعد ٹرسٹیز کمیٹی نے ریزولوشن پاس کر دیا تھا کہ کالج میں کوئی شخص دفن نہ ہو۔ اس کے باوجود ہم ڈاکٹر ضیاء الدین کے دفن کی اجازت دے رہے ہیں۔" افسران نے کہا۔

"جب دفن کی اجازت دی جا رہی ہے تو جگہ بھی مناسب ہونی چاہیے۔"

طلبہ اور اسٹاف ممبران میں تلخ کلامی ہونے لگی اور یونیورسٹی کی طرف سے اعلان

کر دیا گیا کہ کسی فیصلے پر پہنچنے تک تدفین ملتوی کی جاتی ہے۔

''فیصلہ تو ہو چکا'' طلبہ نے نعرہ بلند کیا اور نتائج سے بے پروا ہو کر سہ دری کی طرف بڑھنا شروع کیا تا کہ قبر کھودی جائے۔

افسران یونیورسٹی نے مزاحمت کی اور بعض ممبران اسٹاف نے نامناسب رویہ اختیار کیا لیکن بپھرے ہوئے طلبہ کہاں ماننے والے تھے۔ وہ سرسید کے مقبرے کی مغربی بارہ دری تک پہنچ گئے اور قبر تیار کر دی۔ دوسرے دن جنازہ پھر لایا گیا۔ یونیورسٹی کے عہدے دار اور متعدد ممبران اسٹاف نماز میں تو شریک ہوئے لیکن تدفین چونکہ ان کے حکم کے برخلاف ہو رہی تھی اس لیے دروازۂ مسجد کے بعد جنازے کے ہمراہ کوئی نہیں آیا۔ سب کام طلبہ نے خود سر انجام دیے۔ زندگی بھر طلبہ کے کام آنے والا اب صلہ وصول کر رہا تھا۔ وہ طلبہ کا سب کچھ تھا، اب طلبہ اس کے سب کچھ تھے۔ زندگی بھر اس سے اختلاف کرنے والے اب اس کی تدفین پر بھی اختلاف کر رہے تھے۔

طلبہ نے اپنے محسن کو قبر میں اتارا، مٹی دی اور قبر کو ہموار کر کے چبوترا بنایا۔ نظامت دینیات نے بھی جس کے فرائض میں ایسی خدمات دہی تھی، اس خدمت سے پرہیز کیا اور کوئی متعلقہ شخص مقبرے تک نہیں گیا۔

سپرد خاک چوں شد روح مہدی گفت از جنت

کہ می زیبد ضیاء الدین بزیر دامن سید

۱۳۶۷ھ

☆☆☆☆☆☆

جنازے کی استقبالیہ نظم (اقتباس)

از۔ پروفیسر محمد حاذق، استاذ شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

علی گڑھ تو نے کی ہے اہل ملت کی پذیرائی — ہوئی ہے تجھ میں ارکان حکومت کی پذیرائی

ترے ایوان میں آمد ہوئی اکثر امیروں کی — بڑے ارماں سے کیں تو نے مداراتیں امیروں کی

رئیسان وطن کا تو نے استقبال دیکھا ہے — شہان ذی حشم کا موکب اجلال دیکھا ہے
مگر یہ شان استقبال کی سب سے نرالی ہے — کہ آج اک تیرے شیدائی کی میت آنے والی ہے
بیاں کیا ہو حقیقت قوم کے اندوہ بے حد کی — کہ لاش آتی ہے یورپ سے ضیاء الدین احمد
وہ جس نے اپنی ہستی کو مٹایا قوم کی خاطر — پڑا جو بار وہ سر پر اٹھایا قوم کی خاطر
بڑھاپے میں ملی تھی جس کو ہمت نوجوانوں کی — وہ جس کی خاکساری میں تھی رفعت آسمانوں کی
وہ اپنا ڈاکٹر جو ماہر امراض ملت تھا — جو سچ مچ چارہ ساز قوم تھا نباض ملت تھا
دیار غیر میں جس کے لیے پیک اجل آیا — زمانے میں شہید علم کا جس نے لقب پایا
سن اے خاک لحد سن یہ امانت سونپی جاتی ہے — تجھے سارے مسلمانوں کی دولت سونپی جاتی ہے
قیامت تک اسے آغوش میں رکھ کر امن وراحت سے — کہ یہ خاکی جسد محروم آسائش تھا مدت سے
رہا از بسکہ ملت کی ہوا خواہی سے کام اس کو — ملے جنت میں قرب حضرت خیرالانام اس کو

تاثرات

"ستمبر ۱۹۱۵ء میں شملہ کچس ہوٹل میں میرا ٹھہرنا ہوا۔ اس میں اتفاق سے ضیاء الدین بھی قیام پذیر تھے۔ صبح ہوئی اور ڈاکٹر صاحب گشت کو نکل گئے۔ ابھی حکومت ہند کے ہوم ممبر کے یہاں گئے اور اس سے فلاں فلاں کی سفارش کر آئے۔ وہاں سے اٹھے تو فارن سیکریٹری کے پاس پہنچے اور بولے کہ آپ کے محکمے میں مسلمانوں کی بڑی کمی ہے۔ میں فلاں فلاں امیدوار کے نام آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ آپ پھر چلے تو ناظم تعلیمات کے دفتر میں آ کر رکے اور وہاں بھی دو چار کی کھپت کرائی۔ روزمرہ کا یہی معمول تھا' یہی ان کا وظیفہ۔ ان کاموں کو عبادت کی طرح کرتے اور ہزاروں کی دعائیں لیتے۔"

(عبدالماجد دریا آبادی)

"مرحوم اس دور کی پیداوار تھے جب مسلمانوں پر مغربی تمدن مسلط تھا اور اس کا سب سے بڑا مرکز علی گڑھ تھا لیکن انہوں نے اس کا بہت کم اثر قبول کیا۔ وہ نہ صرف

عقیدے بلکہ ظاہری وضع قطع میں بھی مسلمان رہے۔ان کی زندگی بڑی سادہ اور بے تکلف تھی۔ان کی سادگی میں ایک صاحب کمال کی شان بے نیازی پائی جاتی تھی۔''

(تعزیتی مضمون' معارف علی گڑھ' ۱۹۴۸ء)

یونیورسٹی سے اردو' انگریزی میں ایک ماہ نامہ (میگزین) جدا جدا شائع ہوتا تھا۔

اردو میگزین میں دوسرے اصحاب کے سلسلہ تعزیت میں تیسرے نمبر پر تین چار سطور میں ڈاکٹر صاحب کی تعزیت کی گئی جیسے کوئی خاص بات ہوئی ہی نہیں۔

یہ ایک ایسے آدمی کی تعزیت تھی جو اٹھارہ سال کی عمر میں اس ادارے سے وابستہ ہوا اور مرتے دم تک کسی نہ کسی صورت میں ادارے سے وابستہ رہا۔جس نے کالج کو یونیورسٹی بنانے میں دن رات ایک کر دیے۔جس نے یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن اکیلے تیار کر دیا۔جو اس ادارے کو بچانے کے لیے زندگی بھر مخالفتیں مول لیتا رہا اور مخالفین بھی ایسے ویسے نہیں، اکابرین۔

ایسے محسن کے لیے تعزیت کی تین چار سطریں!

اس وقت شعبہ اردو کے صدر رشید احمد صدیقی تھے جو اردو میگزین کے نگران پروفیسر بھی تھے۔اگرچہ ڈاکٹر ضیاء الدین سیکنڈری تعلیم کے زمانے سے ایم اے تک اور پھر لیکچرار شپ سے پروفیسری تک ان کے محسن اعظم رہے تھے۔ہر وقت کا ساتھ تھا مگر اب فضا بدل گئی تھی۔اب وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنا محسن تسلیم کر چکے تھے۔اس لیے واقفان حقیقت کے نزدیک یہ تین سطور تعزیت بھی غنیمت تھیں۔

طلبہ نے دیگر مرحوم وائس چانسلروں کے مخصوص نمبروں کی طرح ایک خصوصی نمبر شائع کرنا چاہا تو شعبہ اردو نے اجازت نہ دی جس کے صدر رشید احمد صدیقی تھے۔

☆☆☆☆☆☆

اھل سنت و جماعت کی عربی مطبوعات

خود مطالعہ کریں اور دنیائے عرب کے علماء کو بطور تحفہ پیش کریں

(۱) الشیخ احمد رضا خان شاعراً عربیاً: امام احمد رضا بریلوی کی عربی شاعری پر لکھا جانے والا 720 صفحات پر مشتمل عربی مقالہ جس پر مقالہ نگار علامہ ممتاز احمد سدیدی ازھری کو دنیا کی قدیم ترین اور عظیم اسلامی یونیورسٹی جامعہ ازہر شریف سے ایم فل کی ڈگری ملی، امام احمد رضا بریلوی پر عربی میں اتنی ضخیم شائع ہونے والی دنیا بھر میں پہلی کتاب۔
ہدیہ 450/00

(۲) الزمزمة القمرية: قصیدہ غوثیہ کی عربیت پر اعتراض کرنے والوں کا علمی محاسبہ،
تحریر: امام احمد رضا بریلوی قدس سرۂ العزیز۔ ترجمہ: علامہ ممتاز احمد سدیدی ازھری۔ ہدیہ 36/00

(۳) اقامة القيامة: کھڑے ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کے مستحسن ہونے پر دلائل کا سیل رواں،
تحریر: امام احمد رضا بریلوی، ترجمہ ممتاز احمد سدیدی ازھری۔
ہدیہ 33/00

(۴) تكريم ثلاثة من علماء مصر الأزهر: مصر کے تین جلیل القدر علماء کو امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ پر تحقیق کرنے کے سلسلے میں ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی نے گولڈ میڈل پیش کیا، جامعہ ازہر شریف میں منعقد ہونے والی اس انوکھی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال۔
تحریر: علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری۔
ہدیہ 15/00

(۵) امام احمد رضا بریلوی کا عربی دیوان جسے جامعہ ازہر شریف کے استاذ ڈاکٹر سید حازم محمد احمد محفوظ نے مرتب کیا۔
ہدیہ 250/00

(۶) (۱) الامام احمد رضا الحنفی القادری فی میزان الانصاف

(۲) فی ظلال الفتاوىٰ الرضوية ۔ پہلا مقالہ ہالی ڈے ان، اسلام آباد میں انجمن طلباء اسلام کی طرف سے منعقد امام احمد رضا کانفرنس میں ۱۹۹۷ء میں پڑھا گیا۔

دوسرا مقالہ ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے زیر اہتمام منعقد ''بین الاقوامی امام اعظم ابو حنیفہ کانفرنس'' میں ۱۹ جولائی ۱۹۹۸ء کو ہالی ڈے ان، اسلام آباد میں پڑھا گیا۔ ہدیہ 18/00

(۷) النبراس: شرح عقائد کی مشہور اور اہم شرح از رئیس المتکلمین علامہ عبدالعزیز پرہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ
بہترین کاغذ، طباعت، ڈائی دار جلد۔
ہدیہ 270/00

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَآلِہٖ

حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان اوراد سے بہت کچھ پایا۔

ورد اللہ

ہفتہ	کے دن لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سو بار پڑھنے سے غم دور ہو جاتے ہیں
اتوار	کے دن یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ ہزار بار پڑھنے سے روزی غیب سے پہنچے
پیر	کے دن بھی یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ ہزار بار پڑھنے سے روزی بڑھے
منگل	کے دن صَلَّی اللّٰہُ عَلَی النَّبِیِّ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ہزار بار پڑھنے سے ہر بلا ٹل جائے
بدھ	کے دن اَسْتَغْفَار ہزار بار پڑھنے سے قبر کے عذاب سے محفوظ رہے
جمعرات	کے دن لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ ہزار بار پڑھنے سے مالا مال ہو جائے
جمعہ	کے دن اَللّٰہُ ھُوْ سو مرتبہ پڑھنے سے تنگی دور ہو جاتی ہے